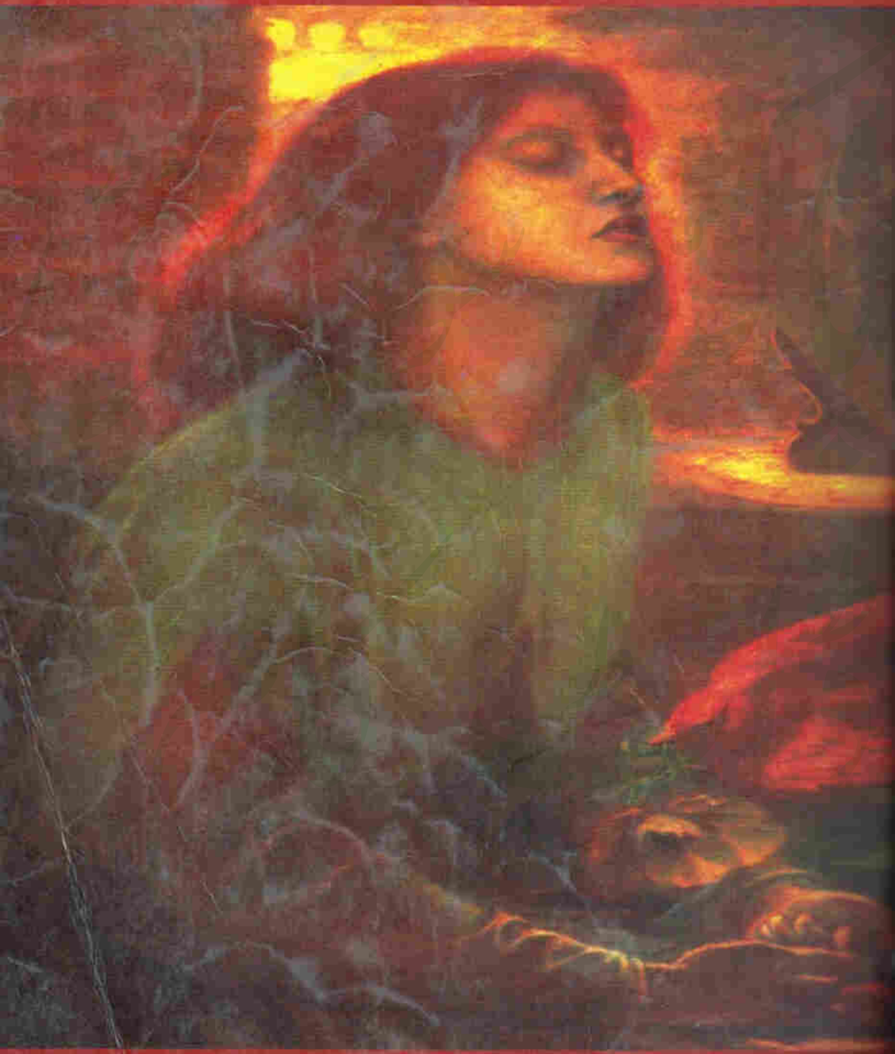
میں کسی کی بیٹی نہیں

راوی: گمنام خاتون
تحریر: عنایت اللہ



JBD PRESS

فہرست

تعارف

اس نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔ اس کا کوئی ایک ٹھکانا بھی نہیں۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں ایک دوست نے مری میں اس خاتون سے پہلی ملاقات کرائی تھی۔ میں نے پہلی نظر میں اسے صرف اتنی سی اہمیت دی تھی کہ یہ ایک خوبصورت اور اونچے درجے کی عصمت فروش عورت ہے۔

میرا دوست چاہتا تھا کہ میں اس خاتون کی آپ بیتی لکھوں۔ وہ جانتا تھا کہ جرم و سزا اور معاشرتی حسن و قبح میرے پسندیدہ موضوع ہیں۔ میں نے جرائم پیشہ مخلوق جس میں بردہ فروش، عصمت فروش اور سمگلر بھی شامل ہیں، زمین دوز دنیا میں جا کر دیکھا، مشاہدہ کیا اور اس پُراسرار اور ہیبت ناک دنیا کی چیدہ چیدہ شخصیتوں کے انٹرویو لئے اور ان کے نفسیاتی تجزیے کئے ہیں۔ اڑھائی برس حوالاتوں، جیل خانوں اور اڈوں کی خاک چھانی ہے۔ اپنے مشاہدات دو کتابوں اور سینکڑوں مضامین کی صورت میں پیش کر چکا ہوں جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں بکھرے ہوتے ہیں۔

اس خاتون سے تعارف ہُوا تو مجھے اس کی دنیا کی اس جیسی کتنی عورتیں یاد آ گئیں جو اسی کی طرح خوبصورت اور پُرکشش تھیں۔ ان کی شکلیں مختلف تھیں کہانی سب کی ایک ہی تھی۔ میں نے اس خاتون کو بھی اسی کہانی کا ایک کردار سمجھا۔ میں اس وقت "حکایت" کے ابتدائی انتظامات اور پہلے شمارے کی تیاری کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اس خاتون کی کہانی بہت طویل تھی۔ میرے پاس سننے اور لکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میرا پہلا شمارہ جنگِ ستمبر نمبر ہو گا جس کے لئے انٹرویو لیتا پھر رہا ہوں۔

"تو آپ بسم اللہ شہیدوں کے نام سے کر رہے ہیں" — اس نے میری معذرت سُنے بغیر کہا — "میری کہانی اسی خاص شمارے میں آجائے تو میری بے چین روح کو کچھ چین آجائے گا۔ میرا سہاگ شہید ہو گیا تھا" — اور اس کے آنسو نکل آئے۔

سہاگ؟ ..... شہید؟ ..... ایک طوائف کا سہاگ شہید ہو گیا تھا؟

میں چونکا اور اس کی آپ بیتی سُننے بیٹھ گیا مگر یہ اس قدر طویل تھی کہ ایک شمارے کے چند صفحات پر سمیٹی نہیں جاسکتی تھی۔ تاہم میں نے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کا ایک حصہ "میں کسی کی بیٹی نہیں" کے عنوان سے اپنے بسم اللہ کے شمارے (ستمبر ۱۹۷۰ء) میں شائع کر دیا، لیکن اس کے سہاگ کی شہادت کا ذکر نہ کیا کیونکہ وہ بہت ہی طویل تھا۔ میں نے اس خاتون سے وعدہ کیا کہ وہ جب چاہے مجھے بلالے میں اس کی تمام تر داستان قلمبند کر کے کتاب کی صورت میں چھاپ دوں گا۔

وہ کہیں لاپتہ ہو گئی۔ وہ چھلاوا ہے۔ نظر آئی اور گئی۔ جس دوست نے پہلی ملاقات کرائی تھی وہ اُسے ڈھونڈتا رہا۔ مسلسل دو سال ڈھونڈتا رہا۔ آخر وہ مل گئی۔ پھر میری اور اس کی ملاقاتوں کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ کبھی لاہور سے اس نے فون کیا کہ فلاں جگہ آجائیں۔ کبھی مری سے ٹرنک کال ملی کہ شام تک مری پہنچ جائیں۔ ایک بار اس نے کراچی بھی بلایا۔ اسی طرح کم و بیش بیس ملاقاتوں میں جو مختلف شہروں میں ہوتیں، میں نے اس کی مکمل آپ بیتی قلمبند کر لی۔

اُن قارئین کے لئے جو یہ کہانی ستمبر ۱۹۷۰ء کے شمارے میں نہیں پڑھ سکے تھے میں نے مئی ۱۹۷۴ء کے شمارے میں اس اعلان کے ساتھ چھاپ دی کہ یہ کتابی صورت میں شائع کی جا رہی ہے۔ میں یہ داستان اسی کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔ کسی رائے اور کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ آپ بیتی صرف اس خاتون کی نہیں، یہ ہمارے معاشرے اور ہماری بداعمالیوں کی روئیداد ہے۔

میں یہ روئیداد کیوں پیش کر رہا ہوں؟ — اس سوال کا جواب اس خاتون کے الفاظ میں سُنئے:

"میں نے یہ کہانی اس لئے نہیں سنائی کہ آپ مجھ پر لعنت بھیجیں یا مجھ سے ہمدردی کریں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اپنے بچوں اور بچیوں پر رحم کریں۔ مجھ سے عبرت حاصل کریں۔ میری کہانی پڑھ کر اپنے گریبان میں مُنہ ڈالیں اور سوچیں کہ لعنت کی حقدار میں ہوں یا کوئی اور؟ میں تو بھنگن ہوں جو آپ ہی کے گھروں کی غلاظت سے بھرا ہوا ٹوکرا سر پر اُٹھائے آپ کے قریب سے گزرتی ہوں تو آپ ناک پر ہاتھ یا رومال رکھ کر مجھ سے دُور بھاگتے ہیں ..... صرف مجھے عصمت فروشی کے جرم میں گرفتار کر کے آپ کی سوسائٹی پاک نہیں ہو جائے گی۔ ذرا دیکھیں کہ غیر قومیں کس طرح آپ کی نئی پود کو اپنے سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ مجھ پر فتویٰ صادر کرنے سے پہلے ان تمام جگہوں کو دیکھیں جن کی میں نے نشاندہی کر دی ہے۔ میری کہانی نرالی یا نئی نہیں۔ آپ کی سوسائٹی ایسی کہانیوں سے بھری پڑی ہے فرق صرف یہ ہے کہ میں نے اپنی داستان سُنا دی ہے۔"

"حکایت" میں اس خاتون کی آپ بیتی دو بار شائع ہوئی تو "حکایت" کے پتے پر اس کے نام سینکڑوں خطوط آئے۔ ان میں چار حضرات نے اس خاتون کو توبہ کرنے اور پانچوں وقت نماز پڑھنے کی تلقین کی ہے اور یہ مژدہ سنایا ہے کہ خدا اس کے گناہ معاف کر دے گا۔ دو جوشیلے نوجوانوں نے ان تمام افراد کو قتل کرنے کی پیشکش کی ہے جنہوں نے اس خاتون کو دھوکے دیئے ہیں اور باقی دو سو تین حضرات نے اس کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

میں نے اسے یہ تمام خطوط دکھائے۔ اس نے ہر خط توجہ سے پڑھا۔ بعض خطوط پڑھ کر وہ مسکرا دی۔ بعض سے اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں، اور کچھ خطوط ایسے بھی تھے جن کے الفاظ نے اس کے آنسو نکال دیئے۔ اس نے کہا — "ان سب حضرات کو فرداً فرداً جواب دینا میرے لئے ممکن نہیں۔ اگر آپ نے کبھی کتاب چھاپی تو ان سب کا شکریہ ادا کر دیجئے گا" — اس نے مجھے اپنے

شہید کیپٹن کا پہلا اور آخری خط اٹیچی کیس میں سے نکال کر دکھایا اور کہا —— "یہی ایک خط ہے جو قبر میں بھی میرے ساتھ جائے گا۔"

میں نے یہ خط اس سے لے کر اس کا عکس اتار لیا۔ یہ خط کتاب کے آخری صفحات پر ملاحظہ فرمایئے۔ اس خاتون کی خواہش کے مطابق عکس میں کیپٹن کا نام نہیں دیا جا رہا اور کتاب "اُس شہید کے نام" منسوب کی جا رہی ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

مَیں کون ہُوں؟

میں ایک فریب ہوں جس نے آپ سب کی فریب کاریوں سے جنم لیا ہے۔

میری عمر تیس سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ چہرے پر وہ رونق نہیں رہی جو چند برس پہلے تھی۔ شب بیداریوں اور بدکاریوں نے میرے حسن میں پہلی سی بات نہیں رہنے دی لیکن میرے فریب کے حسن کی کشش میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لوگ اب بھی مجھے دیکھ کر ٹھٹھک جاتے ہیں۔ ان کی رفتار سست ہو جاتی ہے اور آگے جا کر پیچھے مڑ مڑ کر مجھے دیکھتے ہیں۔ عورت جتنی مستور ہوتی ہے اتنی ہی خوبصورت لگتی ہے۔ وہ عورتیں احمق ہیں جو سر سے دوپٹہ اتارے، بال بکھیرے، بازو کندھوں تک ننگے اور سینہ نیم عُریاں کئے سڑکوں پر گھومتی پھرتی ہیں۔ ایسی نمائش کشش کھو دیتی ہے۔ کشش راز میں ہوتی ہے۔ عورت بھید بن جائے، پُراسرار بن جائے، سیاہ برقعے کا راز بن جائے تو مرد احمق بن جاتے ہیں، اور اس راز کو پا لینے کی مُنہ مانگی قیمت دیتے ہیں، صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے سَو سَو جتن کرتے ہیں۔

اگر آپ کو کسی باغ میں، کسی بس سٹاپ پر، مری کی مال روڈ پر، لاہور اسلام آباد یا کراچی کے کسی بارونق حصے میں کوئی عورت اس طرح کھڑی نظر آ جائے کہ اُس نے ناک اور مُنہ برقعے کے سیاہ اور باریک نقاب میں ڈھانپ رکھا ہو اور اُس کی صرف گوری گوری پیشانی نظر آئے جس پر بھورے بھورے چند ایک بال بکھرے ہوتے ہوں اور اس کی شربتی آنکھیں آپ کو دیکھ کر مسکرا رہی ہوں اور وہ آپ کو آنکھوں سے لطیف سا اشارہ کر دے تو کوشش کریں کہ رکیں

نہیں اسے دیکھیں نہیں اور اس کے قریب نہ جائیں کیونکہ وہ ایک حسین چڑیل ہوگی جو آپ کو کہیں کا نہ چھوڑے گی۔ وہ میں ہوں گی۔ میں اپنا سہاگ اجاڑ چکی ہوں۔ اب سہاگ اجاڑتی پھرتی ہوں۔

میں کوٹھے والی طوائف نہیں، میں بازار میں بیٹھنے والی رنڈی نہیں، میں افسانہ نویسوں والی بیسوا نہیں، میں اُس عورت کی بدروح ہوں۔ جسے خدا نے بیٹی کے بڑے ہی پیارے اور معصوم روپ میں زمین پر اتارا اور جنت اس کے قدموں میں رکھ دی تھی۔ میرے طلبگار مجھے جنتِ ارضی کی حور سمجھتے ہیں مگر میں سیاہ برقعے میں لپٹا ہوا جہنم ہوں۔ میں مقدس عورت کی بھٹکتی ہوئی روح ہوں ——— میں کون ہوں؟

میرا نام کیا ہے؟

میں کہاں کی رہنے والی ہوں؟

کس کی بیٹی؟ کس کی بہن اور کس کی بیوی ہوں؟

میری کہانی میں آپ کو کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں ملے گا۔ ان سوالوں کو اب میں اتنا ضروری نہیں سمجھتی۔ آپ پوچھ کر کریں گے بھی کیا! میں کہیں کی رہنے والی تو ضرور ہوں مگر اب کہیں کی نہیں رہی۔ ایک ماں اور ایک باپ کی بیٹی اور دو بھائیوں کی بہن ہوں۔ میں کسی کی بیوی بھی تھی۔ خاوند زندہ ہے وہ اب بھی خاوند ہے مگر کسی اور کا۔ میں کسی کی بیوی نہیں رہی۔ میری ہر رات سہاگ رات ہوتی ہے اور ہر صبح اُجڑ جاتی ہوں۔ اپنی ماں، اپنے باپ، اپنے بھائیوں اور خاوند کے لئے میں جیتے جی مر گئی ہوں۔ خاوند سے کبھی کی الگ ہو چکی ہوں۔ میں نے اس سے حق مہر اور ماہانہ خرچ کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ طلاق کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میں کسی شریف آدمی کی بیوی بننے کے قابل نہیں تھی۔

اور میرا نام؟ جی ہاں، میں جب پیدا ہوئی تھی تو ماں باپ نے میرا نام رکھا تھا۔ میرے محلے برادری والے، ایک مدت گزری، میرے اس نام پر تھوک چکے ہیں۔ میں نے خود بھی اس نام کو یادوں کی تختی سے مٹا دیا ہے۔ اب میرا کوئی نام نہیں۔ میرے چاہنے والوں نے اپنی اپنی پسند کے میرے نام رکھے ہوتے ہیں۔ سرگودھا کا ایک زمیندار گرمیوں میں مری آتا ہے تو پندرہ بیس روز مجھے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ وہ مجھے بلّو کہتا ہے۔ اسلام آباد کا ایک ڈپٹی سیکرٹری مجھے مُنی کہتا ہے۔ گلبرگ کے شہزادے مجھے سویٹی کہتے ہیں۔ ایک بار میرے ایک بالِش گاہک نے مجھے جان بھی کہا تھا۔ بڑی عمر کے گاہک مجھے عجیب عجیب ناموں سے پکارتے ہیں۔

نام مجھے ایک ہی پسند آیا ہے۔ میں کبھی کبھی اپنے آپ سے باتیں کیا کرتی ہوں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو اسی نام سے پکارتی ہوں۔ یہ نام زیبی ہے۔ پاک فوج کے ایک کیپٹن نے مجھے یہ نام دیا تھا۔ یہ پہلا اور آخری آدمی ہے جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ وہ میرا گاہک نہیں تھا۔ میرے جال میں پھنس گیا تھا مگر جب وہ میرے قریب آیا تو میں اُس کے جال میں پھنس گئی۔ اُس نے میرے اندر انقلاب برپا کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اسے زیبی نام کیوں پسند تھا۔ وہ مجھے زیبی کہنے لگا تو یہ نام مجھے بھی اچھا لگنے لگا۔ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ اپنا ایک فرض ادا کر کے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اگست ۱۹۶۵ء میں مجھے یہ کہہ کر مقبوضہ کشمیر چلا گیا تھا کہ واپس آکر شادی کروں گا مگر وہ نہیں آیا۔ آج تک نہیں آیا اور وہ کبھی نہیں آئے گا۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں شہید ہو گیا تھا۔ اس کی مکمل کہانی آگے چل کر سناؤں گی۔ اس کی یاد آتی ہے تو تڑپ جاتی ہے۔ مجھے اس سے زیادہ سخت سزا اور کیا ملے گی کہ میں شہید کی بیوی نہ کہلا سکی۔ اب اپنے وجود کو ایک شہید کے ساتھ وابستہ کرتے مجھے شرم آتی ہے۔

یوں تو میری ساری زندگی ایک المیہ ہے مگر میری زندگی کے کچھ لمحے ایسے ہیں جو رنج و الم سے بھرپور ہیں۔ پہلا حادثہ تو بچپن میں پیش آیا تھا۔ سکھوں نے میرا گھر جلا ڈالا تھا۔ میرا اسکول جلا ڈالا تھا اور ہم پا پیادہ پاکستان تک آتے تھے۔ چار سال گزرے میرے والد صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ مرحوم وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے تھے۔ انہیں میرا غم اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ بیٹیوں کے باپ کی عزت کچے دھاگے سے لٹک رہی ہوتی ہے۔ جوان بیٹی کسی بھی وقت یہ دھاگہ

توڑ سکتی ہے۔ میں نے لڑکپن میں ہی باپ کی عزت کا دھاگہ توڑ دیا تھا۔ یہی روگ انہیں اتنی جلدی قبر میں لے گیا ہے۔ مجھے صرف یہ غم نہیں کہ میرے والد صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ دُکھ یہ بھی ہے کہ میں نے انہیں مرتے نہیں دیکھا۔ ان کی میّت نہیں دیکھی، اپنی ماں کو روتے نہیں دیکھا۔ میں اس وقت سے کچھ عرصہ پہلے اس گھر سے دھتکاری گئی تھی۔

میں نے والد صاحب کی میّت کے پاس کھڑے ہو کر بَین نہیں کئے، بھائیوں کے گلے لگ کر رو نہیں سکی، ان کا مُنہ نہیں دیکھ سکی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ انہوں نے مجھے مرنے سے پہلے یاد کیا تھا یا نہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے آخری وقت خدا کا شکر ادا کیا ہو کہ وہ اس دنیا سے جا رہے ہیں۔ میرا ناپاک وجود ان کے لئے سراپا روگ تھا۔ میرے گناہوں کی ذمہ داری ان پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن میں نے اب سب کے گناہ اپنے حساب میں لکھ لئے ہیں۔

میرا بچپن شہید ہو گیا

محض اتفاق تھا کہ مجھے والد صاحب کی وفات کی اطلاع مل گئی۔ میں تو اپنے گھر، محلّے اور برادری کے لئے چھلاوا بن گئی تھی۔ میں کبھی کبھی کسی کو دیکھ لیتی تھی مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک روز اپنی ایک پرانی سہیلی نظر آگئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔

میں ایک باغ میں شکار کی تلاش میں گھوم پھر رہی تھی۔ اپنی جان پہچان کے لوگ نظر آتے رہتے تھے لیکن برقعے میں مجھے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ یہ سہیلی نظر آئی تو مجھے بچپن یاد آگیا۔ بڑی پیاری سہیلی تھی۔ میں نے اسے روک لیا۔ چہرے سے نقاب نہیں ہٹایا۔ اُسے بلایا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ پہلے تو حیران ہوئی پھر رو پڑی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں؟ شادی کر لی ہے؟ خاوند کیسا ہے؟ گھر کیوں نہیں آتی؟ میں نے جھوٹے جواب دیئے اور اسے یہ نہیں بتایا کہ میں نے شادی تو نہیں کی لیکن خاوندوں کی کمی نہیں۔ اس نے بتایا کہ میرے والد صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ وہ ہمارے محلّے کی رہنے والی تھی۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ جنازہ کل دس

بجے اُٹھے گا۔ میں دوسرے دن دس بجے قبرستان کے راستے میں جا کھڑی ہوئی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد جنازہ آیا۔ میں نے اپنے دونوں بھائیوں کو اور محلّے کے بہت سے لوگوں کو دیکھا۔ میں نے برقعے کے دونوں نقاب گرائے ہوئے تھے۔ جنازہ دیکھ کر میں تیز تیز قدم اُٹھاتی قبرستان کی طرف چل پڑی۔ قبرستان دُور نہیں تھا۔ وہاں جا کر میں جنازہ گاہ کے قریب ایک قبر پر کھڑی ہو گئی۔ تاکہ کوئی شک نہ کرے۔ جنازہ میرے پاس سے گزرا تو بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ میں بھاگ کر والد صاحب کی میّت کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگنے کو بے تاب ہو گئی تھی۔ باپ بیٹی کو لمبی جدائی کے بعد آخری بار اسی طرح ملنا تھا۔ میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے اور سینے سے اُٹھتی ہوئی چیخوں کو روک لیا۔ میں اس قبر کے سرہانے بیٹھ گئی جس کے پاس میں کھڑی تھی۔ مجھے ماں یاد آ گئی۔ میری ماں بیوہ ہو گئی تھی۔ میں اجنبی قبر پر ہاتھ رکھ کر اتنا روئی کہ ہچکی بندھ گئی۔ مجھے گھر سے نکلے چار پانچ سال گزر گئے تھے۔ میں اتنے عرصے بعد اپنے بھائیوں کو دیکھ رہی تھی اس حال میں کہ میرے باپ کا جنازہ اُٹھائے میرے قریب سے گزر گئے تھے۔

ذرا آگے جا کر میرے ایک بھائی نے جنازے کو کندھا دیا تو مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب والد صاحب مرحوم مجھے کندھے پر اُٹھائے پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے تھے وہ ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کا پچھلا پہر تھا۔ اُس وقت میری عمر ساڑھے چھ سال تھی۔ یہی دو بھائی ساتھ تھے۔ ایک کی عمر بارہ سال اور دوسرے کی سولہ سال تھی۔ ہندوستان کے پانی کا آخری گھونٹ پاکستان کی سرحد سے دو تین میل دُور ایک گندے جوہڑ سے پیا تھا۔ میں اللہ کی درگاہ کی راندی ہوئی بیسوا ہوں، آبرو باختہ ہوں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مجھ جیسی بیسوا کا کوئی مذہب اور کوئی کردار نہیں ہوتا لیکن میں اگست کے مہینے کی عظمت کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اگست کے شہیدوں کو نہیں بھول سکتی جو پاکستان کے نام پر ذبح ہو گئے تھے، زندہ جل گئے تھے، ہجرت میں پیاسے شہید ہو گئے تھے، مجھے اگست کے مہینے میں اتنے یاد آتے ہیں کہ کئی کئی دن روتی رہتی ہوں۔

میری محبت بھی اگست کے مہینے میں شہید ہوئی تھی۔ میں نے اگست ۶۵ء میں اُسے اپنے ہاتھوں مقبوضہ کشمیر کے راستے پر خدا حافظ کہا تھا۔ لوگ اگست کی برسات کو رومان انگیز کہا کرتے ہیں۔ ساون کے مہینے کو شاعروں نے عشق و محبت سے وابستہ کر رکھا ہے مگر ساون کا مینہ برستا ہے تو میں کہا کرتی ہوں کہ آسمان رو رہا ہے۔

میں جب تک آپ کو اگست ۱۹۴۷ء کی ساری روئیداد نہیں سناؤں گی آپ میری کہانی کو مکمل نہیں سمجھیں گی۔ میں نے ہندوستان کے ایک گندے جوہڑ کا ذکر کیا ہے جس سے میں نے پانی پیا تھا۔ اس سے پندرہ میل دُور ایک قصبہ ہے۔ میں اس کا نام نہیں بتاؤں گی۔ میں دو بھائیوں کے بعد اس قصبے میں پیدا ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میری پیدائش پر میرے والدین نے کوئی خوشی نہیں منائی ہو گی۔ ہمارے ہاں لڑکی کی پیدائش پر خوشی نہیں منائی جاتی۔ بعض گھروں میں ماتم تک کیا جاتا ہے۔ والدین کو یہی ڈر ہوتا ہے کہ لڑکی مجھ جیسی نکلی تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اگر میرے والدین نے میری پیدائش پر خوشی نہیں منائی تھی تو اچھا کیا تھا۔ میں نے بڑی ہو کر انہیں بدنامی کے سوا دیا ہی کیا ہے۔

ہمارے قصبے میں ایک چھوٹا سا سکول تھا۔ اسے میں سکول اس لئے کہتی ہوں کہ یہ مسجد نہیں تھی۔ ماحول مسجد والا ہی تھا۔ جُوں جُوں میری عمر آگے بڑھتی جا رہی ہے، یہ سکول میری یادوں پر غالب آتا جا رہا ہے۔ ذہن میں اس کا تصور دن بدن صاف اور واضح ہوتا جا رہا ہے۔ بوڑھا سا ایک استاد ہمیں عربی اور اُردو کا قاعدہ پڑھایا کرتا تھا اور گنتی بھی یاد کراتا تھا۔ اس سکول کی چار جماعتیں تھیں۔ پہلی جماعت میں بچے اور بچیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ دوسری جماعت سے کلاسیں الگ ہو جاتی تھیں۔ ہم چٹائیوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ سکول ایک پرانے مکان میں تھا۔ قصبے کے مسلمان اسے خود ہی چلا رہے تھے۔ مذہب اور اُردو زبان پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ میں نے پہلی جماعت اس سکول میں پڑھی اور دوسری جماعت میں چلی گئی جہاں صرف لڑکیاں تھیں۔ ہماری تعداد کُل سولہ تھی۔ اُس وقت لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ میرے والد صاحب کہا کرتے تھے کہ وہ زمانہ گزر گیا ہے جب لڑکیوں کو

اُن پڑھ رکھ کر بارہ تیرہ سال کی عمر میں پردے میں بٹھا لیا جاتا تھا اور پھر وہ ساری عمر گھر کی قید میں گزار دیا کرتی تھیں۔

مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ چھ سات سال کی عمر کے بچوں کو سیاسی سرگرمیوں سے کیا واسطہ؛ مگر ملک میں سیاسی انقلاب آیا تو مجھ جیسے نہ جانے کتنے ہزار یا کتنے لاکھ بچے کچلے گئے، ذبح ہو گئے اور زندہ جل گئے میں اپنے بچپن کا وہ دن ہزار کوشش کروں تو بھی ذہن سے نہیں نکال سکتی جس دن میرے چھوٹے سے سکول کو سکھوں نے آگ لگا دی تھی۔ اُس وقت سکول خالی تھا۔ ہمیں دو دن پہلے ہی ماں باپ نے سکول جانے سے روک دیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ہمیں مزید چھٹیوں کی خوشی ہوتی لیکن ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ سکول کیوں بند ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہمارے والدین گھبرائے گھبرائے سے تھے۔ انہوں نے ہمیں گھروں سے دُور جانے سے بھی منع کر دیا تھا۔ میرے والد صاحب گھر سے ساٹھ میل دور سرکاری ملازمت میں تھے۔ وہ بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے ایک مہینہ چھٹی لے کر گھر آ گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں بہت خوش ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے بہت ہی پیار کرتے تھے مگر اس دفعہ آئے تو ان کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور وہ کھوئے کھوئے سے تھے۔

پھر وہ دن آیا کہ باہر غل غپاڑہ اور بھاگ دوڑ سنائی دی۔ کسی نے بتایا کہ سکھوں نے ہمارے سکول کو اور دو مسجدوں کو آگ لگا دی ہے۔ والد صاحب گھر نہیں تھے اور میرے دونوں بھائی بھی گھر نہیں تھے۔ میری امی پردہ کرتی تھی۔ وہ برقعے کے بغیر باہر کو دوڑ پڑی۔ اس نے میری پرواہ ہی نہ کی۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر میں روتی، اُس کے پیچھے باہر چلی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ گلی عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں کچھ مرد بھی تھے۔ میری امی اس ہجوم میں غائب ہو گئی تھی لیکن جلدی ہی مجھے نظر آ گئی۔ میرے والد صاحب اسے ساتھ لا رہے تھے۔ امی رو رہی تھی اور میرے بھائیوں کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ گلی میں جو عورتیں تھیں وہ سب چلا رہی تھیں، وہ اپنے خاوندوں اور بیٹوں کو پکار رہی تھیں۔ والد صاحب اور امی اندر سے گئے اور والد صاحب نے بتایا کہ سکھوں نے ہمارے

سکول اور دو مسجدوں کو آگ لگا دی ہے۔ والد صاحب نے یہ بھی بتایا کہ سکھوں نے قصبے کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ مسلمان اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو شام تک یہاں سے چلے جائیں ورنہ سب کو قتل کر دیا جائے گا۔

یہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کا دن تھا۔ اُس روز ہندوستان میں آزادی کا پہلا دن منایا جا رہا تھا۔ ہمارے شہر میں ہندوستانیوں نے ہماری دو مسجدیں اور ایک سکول جلا کر آزادی کی تقریب منائی تھی۔ پاکستان میں آ کر مجھے پتہ چلا تھا کہ ۱۵ راگست کے روز سارے ہندوستان میں ہندوستانیوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی اور یہ خونی کھیل بہت دن جاری رکھا تھا۔ اس روز ہمارے ہاں سکھوں نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ انہیں زندہ نکل جانے کی مہلت دے دی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم نے بہت اچھا وقت گزارا ہے، اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ہاتھوں مسلمان کا خون ہو۔ سکھوں نے سکول اور مسجد کو وارننگ کے طور پر آگ لگائی تھی۔ اپنے گھر سے کون نکلنا چاہتا ہے۔ سورج غروب ہونے تک مجھے معلوم نہیں کہ کتنے مسلمان گھروں سے نکل کر پاکستان کی طرف چلے گئے۔ البتہ ہم نہیں نکلے۔

پھر ایک بڑے ہی ڈراؤنے خواب کی طرح مجھے یاد ہے کہ رات کو میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ ایک زور کے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ کسی نے مجھے اٹھا رکھا تھا اور دوڑ رہا تھا۔ ڈر سے میں نے چیخ ماری تو مجھے والد صاحب کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے مجھے اٹھا رکھا تھا۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ یہ سب کیا ہے میں پوری طرح بیدار ہونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بچپن کی نیند میرے ذہن کو بیدار نہیں ہونے دے رہی تھی۔ مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ میری امی اور دونوں بھائی ساتھ تھے۔ ایک کی عمر بارہ سال اور دوسرے کی عمر سولہ سال تھی۔ یہ بھی یاد آتا ہے کہ بہت ہی شور تھا۔ چیخیں بھی تھیں اور شعلے بھی تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ میں کبھی جاگ اٹھتی اور کبھی گہری نیند سو جاتی۔ دل پر جو خوف طاری ہو گیا تھا وہ بھی یاد ہے۔

اور جب میں پوری طرح جاگی تو میرے سر پر کوئی چھت نہیں تھی۔ اِرد گرد کسی مکان کی دیواریں نہیں تھیں۔ اوپر آسمان اور نیچے زمین تھی۔ اردگرد کھیتیاں اور

ویرانہ تھا۔ میں نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مجھے بڑے بھائی نے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ والد صاحب، چھوٹا بھائی اور امّی ساتھ تھے اور ہم چلے جا رہے تھے۔ ہمارے آگے بھی کچھ کنبے جا رہے تھے۔ کچھ پیچھے بھی آ رہے تھے۔ کچھ لوگ دائیں اور بائیں دُور دُور بھی چلے جا رہے تھے۔ میری امّی رو رہی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی رو رہا تھا۔ بڑے بھائی کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ ہانپ رہا تھا اور تھک گیا تھا۔ میں سب کی طرف دیکھتی تھی مگر ڈر کے مارے کچھ پوچھتی نہیں تھی کیونکہ سب خاموش تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر اور آگے پیچھا دیکھا مجھے اپنا قصبہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سب کی خاموشی اور گرد و پیش سے خوف زدہ ہو کر رونا شروع کر دیا۔ بڑے بھائی نے مجھے کہا۔ "چُپ رہ۔ سکھ آ کے مار جائیں گے۔" میرا خوف بڑھ گیا۔

سورج نکل آیا تھا۔ والد صاحب نے مجھے چلنے کو کہا۔ بڑے بھائی نے مجھے اتار دیا۔ میں چلنے لگی۔ میرے پاؤں میں جُوتی نہیں تھی۔ والد صاحب مجھے ننگے پاؤں اُٹھا لائے تھے۔ میں والد صاحب کی انگلی پکڑے چلتی رہی، چلتی رہی۔ حتیٰ کہ پاؤں درد کرنے لگے اور ٹانگیں دُکھنے لگیں۔ وہ سب تیز چل رہے تھے۔ میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ پیچھے رہ گئی۔ والد صاحب نے مجھے اٹھا کر کندھوں پر بٹھا لیا۔ میں نے ان کے سر کو مضبوطی سے تھام لیا۔ سورج سر پر آ گیا اور ہمیں جلانے لگا۔ مجھے بھوک اور پیاس پریشان کر رہی تھی۔ میں نے کئی بار پانی مانگا۔ والد صاحب نے ہر بار کہا۔ "آگے چل کر پلائیں گے۔" دور سے ایک رہٹ نظر آیا۔ اس کے قریب ایک کچّا مکان تھا۔ والد صاحب نے اُدھر کا رُخ کیا۔ بہت دیر بعد وہاں پہنچے مگر وہاں ایک سیکنڈ کے لئے بھی نہیں رُکے۔ وہاں پانچ لاشیں پڑی تھیں۔ ایک آدمی، ایک عورت اور تین بچّوں کی لاشیں۔ ان کے کپڑے خون سے لال تھے۔ بچّوں میں ایک دودھ پیتا بچّہ تھا۔ ایک کی عمر دو سال نہ ہوتی تو تین سال ہو گی۔ تیسرا میری عمر کا تھا۔ میں چونکہ والد صاحب کے کندھے پر تھی، اس لئے مجھے لاشیں اچھی طرح نظر آ رہی تھیں۔ میرا کنبہ پانی پیئے بغیر وہاں سے دوڑ پڑا اور میں گھوم گھوم کر لاشیں دیکھتی رہی۔

دہشت سے میری زبان بند ہو گئی۔ میں یہ بھی پوچھنے سے ڈرتی تھی کہ انہیں کس نے مارا ہے۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ میری بھوک اور پیاس ماری گئی۔ شاید میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ راستے میں والد صاحب مجھے کندھے سے اُتارنے لگے تو میں چیخیں مارنے لگی۔ بچّی کے لئے باپ رستمِ زماں ہوتا ہے۔ میں اپنے باپ سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی مگر وہ تھک گئے تھے۔ مجھے امّی نے اُٹھا لیا، اور سورج غروب ہونے لگا۔ ہم ایک جگہ رُک گئے۔ سب بیٹھ گئے۔ میں بچّی تھی۔ سو گئی۔ پھر ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح طلوع ہوئی۔ رات کو میں کئی بار ڈر کر جاگ اٹھی۔ ہم سب زمین پر سوتے تھے۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔ صبح میں بھوک سے رونے لگی تو والد صاحب نے مجھے بہت پیار کیا اور جتنی میری سمجھ تھی اتنا مجھے بتایا۔

انہوں نے بہت ساری باتیں بتائی تھیں جن میں سے صرف یہ یاد رہ گئی ہے کہ پاکستان میں ہمارا اپنا گھر ہو گا اور وہاں ہمیں بہت اچھی روٹی ملے گی۔ پھر مجھ سے بڑا بھائی جس کی عمر بارہ سال تھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے میرے والد صاحب کی طرح باتیں کیں۔ مجھے سمجھایا کہ پاکستان کیا ہے اور ہندو اور سکھ ہمارے دشمن ہیں وغیرہ۔ یہ باتیں مجھے اتنی اچھی لگیں کہ میں اور میرا بھائی بچپن میں ہی جوان ہو گئے۔

ہم چل پڑے۔ پہلا قدم اُٹھاتے ہی مجھ میں ایسی تبدیلی آئی کہ میں پتھر بن گئی۔ میں جان گئی کہ میرے ماں باپ میرے پیٹ میں کچھ نہیں ڈال سکتے۔ وہ خود بھوکے اور پیاسے تھے پھر بھی انہیں بچّوں کا غم تھا۔ بہت سارے لوگ اسی سمت کو جا رہے تھے جدھر ہم جا رہے تھے۔ میرے والد صاحب ہم سے الگ ہو کر ان لوگوں میں جا ملے۔ ان لوگوں کی تعداد تھوڑی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد والد صاحب آئے۔ ان کے پاس بُھنے ہوئے چنے تھے۔ انہوں نے خود ایک دانہ بھی مُنہ میں نہیں ڈالا۔ چنے مجھے اور میرے بھائیوں کو دے دیئے۔ میرے بڑے بھائی نے امّی کو دیئے لیکن اُس نے نہیں لئے۔ دریائے ستلج سے کچھ دُور پیچھے ہم نے ایک جوہڑ سے گندا پانی پیا۔ اس سے جسم میں جان آ گئی اور ہم نے دریائے ستلج کا پل پار کیا۔ ان جگہوں کے نام مجھے بہت عرصہ بعد معلوم ہوئے تھے۔ ہم گنڈا سنگھ والا سے پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔

اُس گھر نے مجھے بے گھر کیا

یہ سفر میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ اب بھی کبھی کبھی خواب میں بچوں کی لاشیں اور جلتی ہوئی مسجدیں نظر آتی ہیں۔ بڑے ہو کر مجھے ان سارے سوالوں کا جواب مل گیا تھا جو بچپن سے میرے ذہن کو ڈس رہے تھے۔ پاکستان میں ہمیں بہت اچھا گھر مل گیا۔ والد صاحب سرکاری ملازم تھے۔ ان کا محکمہ ایسا تھا جس کا دوسرے تمام محکموں پر رُعب تھا۔ ان کے اشاروں پہ کام ہو جاتے تھے ہمیں جو مکان ملا کسی امیر کبیر ہندو کا نیا بنایا ہُوا بڑا خوبصورت اور کشادہ مکان تھا۔ اتنا خوبصورت گھر دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوئی وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس میں سارا سامان اور فرنیچر یوں قرینے سے رکھا ہُوا تھا جیسے اس میں رہنے والے ابھی یہاں سے نکلے ہوں اور گھر ہمارے لئے سجا گئے ہوں۔ یہ گلبرگ اور ماڈل ٹاؤن کی طرح کوٹھی نہیں تھی۔ محلے کا ایک مکان تھا لیکن کوٹھی اس کا کیا مقابلہ کرے گی۔ نئی طرز کے صوفے اور پلنگ، ڈائننگ ٹیبل، خوبصورت کرسیاں، چپس کا فرش، ہر کمرے میں چھت کا پنکھا، بیت الخلاء اور غسل خانہ اس قدر دلکش تھے کہ مجھے ان کے استعمال پر شک ہو رہا تھا۔ چھت کے ساتھ فوارہ لگا ہُوا تھا۔ کمرے آٹھ تھے، پانچ نیچے تین اُوپر۔

یہ گھر دیکھ کر میں اُس گھر کو بھول گئی جو ہندوستان میں ہم چھوڑ آئے تھے۔ ہم غریب لوگ تو نہیں تھے۔ درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مکان پرانی طرز کا تھا مگر پاکستان کا یہ مکان دیکھ کر مجھے یہ احساس ہُوا کہ ہم غریبی سے نکل کر آئے ہیں۔ مجھے سارا پاکستان اس گھر کی طرح خوبصورت دکھائی دینے لگا — اور یہ تھا وہ گھر جس نے مجھے بے گھر کیا، کہیں کا نہ چھوڑا۔ آج اُس غریبانہ سے مکان کو ڈھونڈ رہی

ہوں جو میں ہندوستان میں چھوڑ آئی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم وہاں اپنا سامان، ٹرنک، بستر اور چارپائیاں نہیں چھوڑ آئے بلکہ اپنی عزت، خاندانی شرافت اور معصومیت وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ پاکستان کے اس مکان نے ہمارے دماغ خراب کر دیئے اور ہم متوسط طبقے سے ایک ہی جست میں نکل کر امیر بن گئے۔

پاکستان بنا تو مسلمانوں کا بہت کشت و خون ہُوا۔ انسان کی تاریخ میں شاید اس سے بھی زیادہ قتل و غارت ہوتی ہوگی۔ میں نہیں جانتی۔ میں کہتی ہوں کہ ایسی قتل و غارت جو ہندوستان میں ہوتی شاید اس سے پہلے نہیں ہوئی ہوگی۔ دُودھ پیتے بچوں کے پیٹ کسی اور ملک میں چاک نہیں ہوتے ہوں گے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ کر ان سے بچے نکال کر برچھیوں میں نہیں پروتے گئے ہوں گے۔ ہزارہا لڑکیوں کی آبروریزی نہیں ہوتی ہوگی۔ بچوں کو زندہ نہیں جلایا گیا ہوگا۔

اتنی زیادہ لڑکیوں نے عصمت بچانے کے لئے کنوؤں میں چھلانگیں نہیں لگائی ہوں گی۔ اتنی زیادہ لڑکیاں کہیں اور اغوا نہیں ہوتی ہوں گی۔ پردہ نشین لڑکیوں کو ننگا کر کے ان کے جلوس نہیں نکالے گئے ہوں گے۔ اتنے زیادہ مکان کسی اور ملک میں نہیں جلائے گئے ہوں گے۔ اتنے لاکھ دہشت زدہ انسان، زخموں سے چُور، بھوکے پیاسے، ایک سے دوسرے ملک کو قافلہ در قافلہ نہیں گئے ہوں گے۔ اتنی زیادہ لاشیں کسی ملک میں نہیں گئی ہوں گی جتنی پاکستان میں آئیں اور کسی قوم نے اپنے جھنڈے کی خاطر اتنی سنسنی خیز قربانی کبھی نہیں دی ہوگی جو ہندوستان کے مسلمانوں نے دی مگر ایک اور حادثہ بھی ہُوا جو کم ہی لوگ محسوس کر سکے۔ وہ یہ تھا کہ سرحد پار معمولی سے مکانوں میں رہنے والے لوگ پاکستان میں محل جیسے مکانوں کے مالک بن گئے اور بعض محل جیسے مکانوں میں رہنے والے ایک مدت ریفیوجی کیمپوں میں پڑے رہے پھر جھگیوں، تنگ و تاریک کوارٹروں یا معمولی سے مکانوں میں جا آباد ہوتے۔ ان کی بدنصیبی یہ تھی کہ میرے والد صاحب کی طرح وہ ایسے محکمے کے ملازم نہیں تھے جو چٹان سے دُودھ کی نہر نکال سکتا ہے۔ وہ چالاکی اور ہاتھ کی صفائی سے بھی ناآشنا تھے۔ وہ صبر و تحمل سے بیٹھے رہے کہ ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی اور انہیں ان کا حق مل جائے گا مگر وہ

آسمان سے ایسے گرے کہ کھجور میں بھی نہ اٹکے، سیدھے زمین پر آرہے اور پھر زمین کے کیڑے مکوڑے بن گئے۔

مگر میں اُس باپ کی بیٹی تھی جو محکمے کی کدال سے چٹان سے دُودھ نکال سکتا تھا۔ ہمیں محل جیسا مکان مل گیا جس میں فرنیچر کے علاوہ ٹرنک بھی تھے اور گدّوں رضائیوں سے بھری ہوئی بہت بڑی پیٹی تھی۔ ٹرنکوں میں ریشمی کپڑے اور ساڑھیاں تھیں پھر ہم امیر کیوں نہ کہلاتے؟ اس کے ساتھ ہی خدا نے ہم پر ایک اور کرم کیا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب کو اتنی ترقی مل گئی جو وہ ہندوستان میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ ترقی صرف مالی نہیں بلکہ عہدہ تھا۔ ترقیاں ملنی ہی تھیں۔ ہر محکمے میں ہندو زیادہ تھے۔ میرے والد صاحب کا محکمہ تو ہندوؤں سے بھرا ہُوا تھا۔ وہ سب ہندوستان چلے گئے۔ دفتروں کا نظام چلانے کے لئے پرانے آدمیوں سے آسامیاں پُر کی گئیں اور نیچے والے درجوں کو نئی بھرتی سے پُر کیا گیا۔ میرے والد صاحب کی سروس بہت ہو چکی تھی۔ وہ افسری کے درجے تک پہنچ گئے مگر ان کا اور میرے بڑے بھائی کا دماغ افسری سے بھی چند درجے اوپر چلا گیا جس کا احساس مجھے اُس وقت ہُوا جب میں افسری اور امیری کے نشے میں اپنی عصمت لٹا چکی تھی اور میں اس مقام تک پہنچ چکی تھی جہاں سے میرا واپس آنا اور شریف لڑکی کہلانا ناممکن ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے والد صاحب میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھی۔ وہ سیدھے سادے طریقے سے باتیں کیا کرتے تھے اور سادا سا لباس پہنا کرتے تھے مگر ترقی ملی تو ان کی سادگی ختم ہو گئی۔ سوٹ پہننے لگے، ٹائی باندھنے لگے اور باتیں مصنوعی طریقے سے کرنے لگے۔ ہم فرش پر دری بچھا کر کھانا کھایا کرتے تھے لیکن والد صاحب نے یہ طریقہ ممنوع قرار دے دیا اور کہا کہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھایا کرو۔ نوکر ضروری سمجھا گیا۔ والد صاحب نے دفتر کا ایک چپڑاسی گھر رکھ لیا۔ جسے تنخواہ دفتر سے ملتی تھی مگر رہتا ہمارے گھر میں تھا اور گھر کا نوکر بن گیا تھا۔ یہ والد صاحب کی پہلی غیر قانونی حرکت تھی۔ یہ کامیاب رہی۔ پھر کتنی غیر قانونی حرکتوں کے راستے کھل گئے۔ ان تمام راستوں نے مجھے تباہی کی منزل تک پہنچایا اور اب تک میں کتنی گھرانوں

کو، کتنی سہاگنوں کے سہاگ کو تباہی کی منزل تک پہنچا چکی ہوں۔

مگر اپنے والد صاحب کی (اور بعد میں) بھائیوں کی کجروی کو میں نے اُس وقت محسوس کیا جب میں تباہ ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے یہ شوبازی، تصنع اور نمود و نمائش مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ یہاں آتے ہی مجھے لڑکیوں کے ایک پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا جو میرے ہندوستان والے سکول سے بہت اچھا تھا۔ یہ ایک باقاعدہ سرکاری سکول تھا۔ سکول کے لوازمات موجود تھے۔ اس میں بھی بچیاں چٹائیوں پر بیٹھتی تھیں۔ پڑھانے والا کوئی بوڑھا آدمی نہیں بلکہ استانیاں تھیں۔ تعلیم اُردو میں تھی۔ دینیات پر زیادہ زور دیا جاتا تھا مگر چھ مہینے بعد جب ہمارے گھر میں افسری داخل ہو گئی، مجھے سکول کی بچیاں بُری لگنے لگیں۔ میں ریشمی کپڑے پہن کر سکول جایا کرتی تھی۔ یہ کپڑے اُن ساڑھیوں سے بنائے گئے تھے جو اسی مکان میں چھوڑے ہوئے ٹرنکوں سے برآمد ہوئی تھیں۔

اس سکول میں دوسری خرابی یہ تھی کہ ہندوستان سے آئی ہوئی بچیوں کو پناہ گزین کہا جاتا تھا۔ پناہ گزینوں کی بچیوں کی فیس معاف کر دی گئی تھی۔ ان میں بیشتر بچیاں غریبانہ کپڑے پہن کر آتی تھیں۔ بعض کی قمیضوں کے سائز بڑے اور بعض کے چھوٹے تھے۔ یہ کپڑے انہیں خیرات کے طور پر کہیں سے ملے تھے۔ اکثر بچیاں کم خوراک اور تنگدستی کی وجہ سے زرد پیلی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے میری طرح قتلِ عام دیکھا اور مکان جلتے ہوئے دیکھے تھے۔ انہوں نے موت کے سائے میں بھوکے پیاسے پاپیادہ سفر طے کیا تھا۔ پاکستان میں آکر بھی ان کے ذہنوں میں دہشت موجود تھی جو ان کی آنکھوں میں صاف نظر آتی تھی۔ اگر استانی کسی مہاجر بچی کو ڈانٹتی تو بچی اس طرح سہم کر چیخ اٹھتی تھی جیسے اسے قتل کیا جا رہا ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ بچہ شوخی اور شرارت کی بدولت بچوں میں مقبول ہوتا ہے مگر مہاجر بچیوں کی شوخیاں سرحد کے اُس طرف رہ گئی تھیں۔ ان مری مری بچیوں کو مقامی بچیاں پناہ گزین کہتی تھیں۔

پھر "پناہ گزین" گالی بن گئی جس کی ابتدا ہماری استانی نے کی۔ ایک روز اس نے ایک بچی کو چار کا پہاڑا سنانے کو کہا۔ بچی اٹک اٹک کر اور گھبرا کر پہاڑا سنانے لگی۔ استانی نے اسے ڈانٹ کر کہا "کیا پناہ گزینوں کی طرح منہ بسور کے سنا رہی ہو۔ اچھی طرح سنا۔" کلاس میں بچوں نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا اور استانی بھی ہنس پڑی۔ اس کے بعد "پناہ گزین" طعنہ اور گالی بن گئی۔ میں بھی پناہ گزین تھی۔ میں دوسری مہاجر بچیوں کی طرح پرانے اور میلے کچیلے کپڑے نہیں پہنا کرتی تھی مگر میں پناہ گزین تھی۔ ایک روز اسی استانی نے میرے ریشمی کپڑوں کا بھرم یہ پوچھ کر توڑ دیا۔

"یہ کپڑے تجھے کس نے دیئے ہیں؟"

میں تھی تو چھوٹی سی بچی لیکن استانی کا یہ سوال خنجر کی نوک کی طرح میرے دل میں اُتر گیا۔ پناہ گزین بچی ہونے کی وجہ سے مجھ پر بھی دہشت طاری تھی۔ ضرورت یہ تھی کہ ہمارے ساتھ پیار کیا جاتا اور ہمیں احساس دلایا جاتا کہ ہم پاکستانی بچیاں ہیں اور ہمیں وہ سب کچھ فراموش کر دینا چاہیئے جو ہندوستان میں ہمارے ساتھ ہوا مگر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ ہم بن بلائے مہمان ہیں۔ خلق کے راندے ہوئے بچے ہیں۔ پاکستان صرف اُن کا ہے جو پاکستان میں پیدا ہوتے تھے۔ استانی نے اپنا سوال پھر دہرایا تو میری زبان بند ہو گئی۔ میں استانی کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ ساری کلاس کی بچیاں میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں تماشہ بن گئی۔ استانی نے ڈانٹ کر کہا "بولتی کیوں نہیں؟" میں بولنے کی بجائے رو پڑی۔

دیکھئے صاحب! اگر آپ انسان کی نفسیات کو سمجھتے ہیں تو آپ کو یہ سمجھنے میں دقت محسوس نہیں ہو گی کہ مجھ میں اور دوسری "پناہ گزین" بچیوں میں کس قسم کا احساسِ کمتری پیدا ہُوا ہو گا اور ردِعمل کے طور پر ان کے اندر کیسے کیسے زلزلے بپا ہُوتے ہوں گے۔ میں تعلیم یافتہ عورت ہوں بی ٹی اے میں تھی جب کالج اور گھر سے فرار ہوئی تھی۔ اگر پیشہ عصمت فروشی نہ ہوتا تو میرے بچے ہوتے اور میں ان کے ذہنوں میں احساسِ کمتری پیدا نہ ہونے دیتی مگر میں خود اس تباہ کن احساس کا شکار ہو گئی تھی۔ میں دوسری بچیوں کے متعلق یہی کچھ بتا سکتی ہوں کہ وہ اور زیادہ بُجھ گئیں۔ میرا ردِعمل یہ تھا کہ میں نے مقامی بچیوں پر رعب جمانے کے لئے کہ میں پناہ گزین تو ہوں غریب نہیں ہوں، اور زیادہ اچھے کپڑے پہننے شروع کر دیئے اور بچیوں کو یہ بتانا شروع کر دیا کہ میں اتنے بڑے گھر میں رہتی ہوں۔ ہمارے گھر میں صوفے ہیں، دروازوں اور کھڑکیوں کے ساتھ پردے لگے ہوتے ہیں اور ہم میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرا ذہن بہتر ہونے کی بجائے غلط سوچوں میں اُلجھ گیا اور مجھ میں شوبازی پیدا ہو گئی۔

مُسلم سکول سے مشنری سکول تک

ایک روز میں نے والد صاحب کو بتایا کہ سکول میں مجھے "پناہ گزین" کہتے ہیں۔

میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ یہ سکول مجھے پسند نہیں۔ اُس وقت تک والد صاحب کو ترقی مل چکی تھی۔ میرے دونوں بھائی اچھی قسم کے ہائی سکول میں داخل کئے گئے تھے۔ والد صاحب نے میری شکایت سنی تو مجھے سکول جانے سے روک دیا۔ دو روز بعد وہ مجھے اپنے ساتھ ایک اور سکول میں لے گئے۔ بہت ہی خوب صورت سکول تھا۔ اس سکول کے متعلق آپ کو تفصیل سے ساری باتیں بتا کر اپنی کہانی سناؤں تو بہتر ہوگا ورنہ آپ پر میں وہ بات واضح نہیں کر سکوں گی جو میں واضح کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے میں یہ واضح کر دینا اور زیادہ ضروری سمجھتی ہوں کہ میں اپنی داستان آپ کی ذہنی لذت کے لئے نہیں سنا رہی۔ میں دراصل اُن والدین کو خبردار کرنا چاہتی ہوں جو میرے والدین کی طرح بچیوں کو مشنری سکولوں میں داخل کرا کے فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی بچیاں انگریزی پڑھ رہی ہیں، اور جوان ہو کر کوٹھیوں اور کاروں والوں کے ساتھ بیاہی جائیں گی۔ میں ایسے والدین کی خوش فہمیاں دُور کرنا چاہتی ہوں —— اور میں یہ بھی کہہ دوں تو بے محل نہ ہوگا کہ میری آپ بیتی میں آپ کو ذہنی لذت کا بہت سا سامان ملے گا۔ اپنے معاشرے کے مردوں کو جتنا میں جانتی ہوں اتنا اور کوئی نہیں جان سکتا۔ میرے پاس آ کر مرد صرف جسمانی طور پر ہی ننگے نہیں ہو جاتے بلکہ وہ اپنے ضمیر بھی ننگے کر کے میرے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پاکستان کی مردانگی پر جنسی جنون طاری ہو چکا ہے۔ آپ کے رسالوں اور فلموں نے نوجوانوں کا رُخ میری طرف موڑ دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میری آپ بیتی سے بھی جنسی لذت حاصل کر کے وہ میرے اصل مقصد سے نگاہیں پھیر لیں گے۔ میرا مقصد یہ ہے

کہ مرد پڑھیں تو یہ سوچ انہیں تڑپا دے کہ ان کی بہن، بیٹی، بھانجی یا بھتیجی جو کسی انگریزی سکول میں پڑھ رہی ہے کہیں میری کہانی کی ہیروئن تو نہیں بن رہی؟

یہ ہیں عیسائیوں کے مشنری سکول جو انگریزوں کے دورِ حکومت میں عیسائیت کے فروغ کے لئے ہندوستان میں کھولے گئے تھے۔ آزادی کے بعد یہ پاکستا کے حصے میں بھی آئے۔ یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں یہ پہلے سے موجود ان سے آپ ناواقف نہیں۔ ان کے نام کچھ اس قسم کے ہیں۔ جیسے میری کانونیٹ سنیٹ کیتھیڈرل۔ ڈان باسکو وغیرہ۔ ان کے ناموں سے ظاہر ہے کہ یہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک مدت گزری عیسائی مشنریوں یعنی مبلّغوں نے یہ سکول اا اچھوتوں، بھنگیوں وغیرہ کے لئے کھولے تھے جن کے لئے ہندوؤں، سکھوں اا مسلمانوں کے سکولوں میں داخلہ ممنوع تھا۔ عیسائی مشنریوں نے اس کلاس کو تعلیم دینے کے لئے یہ سکول کھولے اور ہر سکول میں گرجا بھی بنایا۔ سکولوں کو صاف ستھرا بنایا اور ان میں ایسی پُروقار سی کشش پیدا کر دی کہ اچھے گھرانے کے لوگ بھی اپنے بچّوں کو ان سکولوں میں داخل کرنے لگے۔

پاکستان بنا تو ان سکولوں کی مقبولیت بڑھ گئی۔ اس کی کچھ وجوہات تھیں ایک یہ کہ پاکستان کے افسروں اور امیر طبقے کے لوگوں نے اپنے آپ کو انگریزوں کا جانشین سمجھ کر اپنے بچّوں کو عام قسم کے سکولوں میں پڑھانا اپنی توہین سمجھا — دوسری وجہ یہ کہ عام سکولوں کی حالت بہتر ہونے کی بجائے اور زیادہ خراب ہو گئ تھی۔ استادوں کا معیار اتنا گر گیا کہ وہ ننگی گالیاں بکتے تھے اور بچّوں سے ایک ایک دو دو پیسے لے لیتے تھے۔ اب دیکھ لیجئے اپنے سکولوں کی حالت۔ اس سے تو کباڑخانے اور مچھلی مارکیٹ کچھ بہتر ہوگی۔ تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی عیسائی مشنریوں نے جب پاکستانی سکولوں کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے اپنے سکولوں میں اور زیادہ کشش پیدا کر دی۔ پھر وہ وقت آیا کہ ان سکولوں میں داخلہ ملنا ناممکن ہو گیا۔ اب یہ حال ہے کہ بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا نام کسی مشنری سکول میں رجسٹر کرا دیا جاتا ہے۔ جب وہ پانچ چھ سال کا ہوتا ہے تو بھی اسے داخلہ نہیں مسلمان، پادریوں کی سفارشیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور بچّوں کو داخل

کراتے ہیں۔ وہ ان سکولوں کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہاں بچّوں کے ذہنوں میں عیسائیت کے جراثیم بھرے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی علمائے دین کو خیال آجاتا ہے تو وہ ان کانونیٹ قسم کے مشنری سکولوں کے خلاف اخباروں میں بیان چھپواتے یا مسجدوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ چند دن اس قسم کا شور و غوغا سنائی دیتا ہے کہ مشنری سکولوں کو بند کرو، یہ بچّوں میں غیر اسلامی رجحانات پیدا کر رہے ہیں، پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ عیسائیوں کے سکولوں کی مقبولیت میں اور اپنے سکولوں کے خلاف نفرت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس قباحت سے اپنے بچّوں کو بچانے کا واحد حل یہ ہے کہ اپنے اردو سکولوں کا معیار مشنری سکولوں جیسا ہو جائے اور ان میں وہی کشش پیدا کی جائے جو لوگ مشنری سکولوں میں دیکھتے ہیں مگر اس طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اب تو گلی گلی پرائیویٹ سکول کھل گئے ہیں جو تعلیمی نہیں بلکہ تجارتی ادارے ہیں۔ فیسوں اور فنڈوں کے نام سے والدین سے ناحق اور بے دریغ پیسے بٹورتے ہیں۔ محفلِ میلاد اور ختمِ قرآن کے بہلانے بچّوں سے چار چار آنے لے لئے جاتے ہیں اور وہاں ہوتا کچھ بھی نہیں۔ اس کے مقابلے میں مشنری سکول جانفشانی اور یکسوئی سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروفِ عمل ہیں۔

مگر اب عیسائیوں کے سکول بند ہو جائیں، مسلمانوں کے سکول سُدھر جائیں، میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرا اپنا کوئی بچّہ نہیں جس کی تعلیم کی مجھے فکر ہو اور نہ میرے بطن سے کبھی بچّہ پیدا ہوگا۔ مجھے جس تباہی تک پہنچنا تھا پہنچ گئی ہوں۔ اب یہی ایک آرزو ہے کہ پاکستان کا محکمۂ تعلیم، حکومت اور والدین میرے انجام کو دیکھ کر سبق حاصل کریں۔ میں آپ سب کو یہ بھی بتا دینا چاہتی ہوں کہ مجھ جیسی نہ جانے کتنی لڑکیاں تباہی تک پہنچ چکی ہیں مگر وہ بولتی نہیں۔ معاشرے میں یا اپنے گھروں میں سزائیں بھگت رہی ہیں۔

شرم و حجاب اُٹھنے لگا

میں اس سکول میں داخل ہو گئی۔ میرے لئے کتابیں خریدی گئیں۔ سب انگریزی کی تھیں جن کے ہر صفحے پر رنگا رنگ تصویریں تھیں، پھر میرے لئے یونیفارم سلوائی گئی۔ کلاس روم میں گئی تو ڈیسک دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ تصویریں آویزاں تھیں۔ سامنے حضرت عیسیٰ کی اور کنواری مریم کی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ کلاس میں بچے اور بچیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ کوئی شور شرابا نہ تھا۔ بچے صاف ستھرے تھے اور انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔ استانی کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ کسی بچے کو کچھ سمجھ نہ آتے تو استانی بڑے پیارے طریقے سے سمجھاتی تھی۔ تقریباً تمام بچے امیر والدین کے تھے۔ میرے والد صاحب کو اس کا احساس تھا اس لئے وہ مجھے چار یا پانچ آنے روزانہ دیا کرتے تھے تاکہ کوئی مجھے غریب ماں باپ کی بچی نہ سمجھے۔ میں احساسِ کمتری کی ماری ہوئی تھی۔ میری کوشش یہ تھی کہ کوئی مجھے غریب اور پناہ گزین نہ سمجھے۔ اس کا میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ڈھینگیں مارنی شروع کر دیں اور جھوٹ بول بول کر ظاہر کرنے لگی کہ میرے والد صاحب بہت بڑے افسر ہیں اور ہم امیر لوگ ہیں۔

گھر میں امی نے مجھے قرآن پڑھانا شروع کر دیا تاکہ میں بڑی ہو کر مشرق کی روایتی عورت بنوں۔ سکول کا ماحول غیر اسلامی تھا جس میں یورپ کی آزادی تھی اور وہاں کے ماحول میں اتنی جاذبیت تھی کہ غیر اسلامی اثرات اور یورپ کی آزادی از خود خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھال رہی تھی۔ گھر کا ماحول مشرقی تھا اور سکول میں مغرب کا طلسم۔ یہ مجھے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ سکول جا کر میں گھر کی گھٹن سے نجات حاصل کر لیتی تھی۔ گھر آکر میں اپنی ان ہم جماعت بچیوں کو جن کے ساتھ میں اس گھٹیلے سکول میں پڑھا کرتی تھی، اپنے سکول کی خوبصورتی کے قصے سنایا کرتی تھی۔ وہ مجھے

پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا کرتی تھیں جس سے مجھ پر برتری کا نشہ طاری ہو جاتا تھا۔ جُوں جُوں مجھ پر یورپ کا رنگ چڑھتا جا رہا تھا، میں دینیات کا مذاق اُڑانے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ ذہن کچا تھا۔ اس میں پیار اور پُرکشش طریقوں سے جو رنگ بھرا جا رہا تھا وہ پکا ہوتا جا رہا تھا۔

اتنی زیادہ تفصیلات میں جانے کی میں ضرورت نہیں سمجھتی کہ میں کس طرح معصومیت سے اپنے تہذیب و تمدن سے دور ہٹتی گئی اور مجھ میں بناوٹ اور نمائش پیدا ہوتی گئی۔ سکول میں پاکستان اور اسلام کا تو نام و نشان ہی نہیں تھا بلکہ فضا ایسی تھی کہ یہ دونوں چیزیں پسماندگی بلکہ جہالت کی نشانیاں معلوم ہوتی تھیں۔ بچے انگریزی بولتے تھے اور اپنے آپ کو پاکستانی کہلاتے شرماتے تھے۔ یہ تو میں آج محسوس کرتی ہوں کہ اپنے بچوں کو ہمیں پہلی جماعت میں ہی یہ پڑھانا چاہیئے کہ ہم نے لاکھوں بچوں کی قربانی دے کر پاکستان حاصل کیا ہے مگر مشنری سکول میں میرے ذہن سے پاکستان کے وجود کو ہی صاف کر دیا گیا تھا اور میں بھول ہی گئی تھی کہ میں پاکستان کی چلتی پھرتی تاریخ ہوں اور اس مقدس سرزمین کی خاطر میں نے بھی قربانی دی ہے۔

اس سکول میں میرا چوتھا سال تھا جب سکول کی مقبولیت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ کسی خوش قسمت کو ہی داخلہ ملتا تھا۔ صبح کاروں کی قطاریں بچوں کو سکول چھوڑنے آتی تھیں اور چھٹی کے وقت سکول کے باہر کاروں کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔ میں پیدل آیا جایا کرتی تھی اور مجھے یہ احساس شرمسار کیا کرتا تھا کہ میں کار میں نہیں آتی جاتی۔ کار میرے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ میں نے اُن لڑکوں کے ساتھ دوستانہ گانٹھ لیا جو کاروں پر آتے جاتے تھے۔ یہاں میں اپنی اس بدنصیبی کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں کہ خدا نے مجھے رنگ گورا اور شکل و صورت اتنی اچھی دی ہے کہ سکول میں بچے مجھے امیر ماں باپ کی بچی سمجھتے تھے اور بڑے ہو کر جس نے دیکھا بُری نظر سے دیکھا۔ امیروں کے بچے کنٹین میں بہت پیسے خرچ کرتے تھے اور اچھی اچھی چیزیں کھاتے تھے مگر میرے پاس زیادہ سے زیادہ چار آنے ہوتے تھے۔ دوستی میں زیادہ خرچ کرنا پڑتا تھا جو میں نے گھر سے چوری کے ذریعے پورا کرنا شروع کر دیا۔ والد

صاحب کو اب بالائی آمدنی بھی ہونے لگی تھی۔ آٹھ آنے سے ایک روپے تک کی چوری کا گھر والوں کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ ان پیسوں سے میں نے یہ جھوٹا بھرم قائم رکھا کہ میں امیر بچی ہوں۔

میرے والدین اکثر اس خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے کہ ان کی بچی انگریزی سکول میں پڑھتی ہے اور بڑی ہو کر لیڈی ڈاکٹر بنے گی۔ کاش یورپی طرز کے انگریزی سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے والدین ان سکولوں کے اندر جھانک کر دیکھیں کہ مسلمان بچیوں کو کس طرح بے حیائی کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ہمیں اُستانیاں بتایا کرتی تھیں کہ امریکہ کس قدر دولت مند ملک ہے اور یہی ایک ملک ہے جو دنیا کے تمام ممالک کا محافظ اور روزی رساں ہے اور جو پاکستان کو گندم، پیسے اور خشک دُودھ کے ڈبے دیتا ہے۔ ہمیں لٹریچر اور فلموں کے ذریعے امریکی تہذیب و تمدن میں رنگا جا رہا تھا۔ مجھے یہ رنگ بہت ہی پسند تھا۔ میں والد صاحب کو اباجی کہا کرتی تھی لیکن سکول میں کہا کرتی تھی "میرے ڈیڈی"۔

سکول میں میرا ساتواں سال تھا۔ میری عمر چودہ سال ہو گئی تھی — میرا بڑا بھائی والد صاحب کی سفارش سے ایسے محکمے میں ملازم ہو گیا تھا جہاں بالائی آمدنی بہت تھی۔ بھائی کہتا تھا کہ میں کسی سے مانگتا نہیں کیونکہ میں رشوت کے سخت خلاف ہوں لیکن لوگ میری جیب میں پیسے ڈال کر میرا ایمان خراب کر جاتے ہیں۔ ایمان لوگ خراب کرتے تھے یا خود میرا بھائی، ہوا یہ کہ رشوت کا پیسہ جوں جوں گھر آتا گیا گھر سے ایمان اُٹھتا گیا، شرم و حجاب اٹھتا گیا، میں نے امی سے قرآن کا سبق لینا چھوڑ دیا۔ امی کا مطالبہ تھا کہ میں اب برقعے میں سکول جایا کروں اور وہاں جا کے اُتار دیا کروں لیکن میرے دونوں بھائیوں نے نہ صرف مخالفت کی بلکہ برقعے کا مذاق اُڑایا اور امی کو بھی ماڈرن بنانے کی کوشش کی۔ میرا چھوٹا بھائی کالج میں تھا۔ والد صاحب اور بڑے بھائی کی بالائی آمدنی نے اسے مکمل طور پر ماڈرن بنا دیا تھا۔ اُس وقت ہپی نہیں ہوتے تھے، ماڈرن لڑکے ٹیڈی بوائز کہلاتے تھے اور ہیجڑوں کی طرح حرکتیں کیا کرتے تھے۔ اب دونوں بھائی مجھے بھی ماڈرن بنانے لگے حالانکہ میں ان معنوں میں ماڈرن بن چکی تھی کہ مجھ میں چودہ

سال کی عمر کی لڑکیوں والا حجاب نہیں رہا تھا۔ اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کو مشنری سکول میرے ذہن سے صاف کر چکا تھا۔ میں اپنی زبان سے بھی متنفر ہوتی جارہی تھی۔ سکول میں انگریزی بولتی تھی۔ گھر اور محلے میں آدھی انگریزی، کچھ اردو اور باقی بات پنجابی میں کیا کرتی تھی۔

مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے جب ایک صبح سکول جاتے وقت میں نے امّی سے کہا تھا۔ "امّی! لنچ پر میرا انتظار نہ کرنا۔ سکول میں فنکشن ہے۔ میں آفٹر نون ٹی تک پہنچ جاؤں گی۔" یہ سن کر امّی ہنس پڑی تھی اور اُس نے کہا تھا۔ "بیٹا، مجھے تو خاک سمجھ نہیں آئی تُو نے کیا کہا ہے۔" امّی کی ہنسی پر مجھے غصّہ آگیا تھا اور میں نے طنزیہ لہجے میں امّی کو بتایا تھا کہ میں نے کیا کہا ہے۔ آج برسوں گزر گئے ہیں، امّی کی وہ ہنسی مجھے صاف سنائی دیتی ہے۔ اُس وقت تو امّی کی ہنسی میں پیار اور بے لبسی تھی مگر اب اُن کی ہنسی جو مجھے تنہائی میں سنائی دیتی ہے، اس میں طنز اور زہرخند ہوتا ہے۔ امّی نے مجھے کہا تھا کہ بیٹا مجھے خاک سمجھ نہیں آئی تُو نے کیا کہا ہے۔ کاش آج امّی سامنے آتے تو اس کے پاؤں پکڑ کر کہوں۔ "امی! میری بدنصیبی یہ ہے کہ تُو میری نہیں بلکہ میں تیری بات نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس کی سزا دیکھ۔ میں سڑکوں پر اور ہوٹلوں میں ایک رات کے خاوندوں کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔"

میں عمر کے چودھویں سال کی بات کر رہی تھی۔ میں نے دو سال پہلے کاروں والے لڑکوں کے ساتھ دوستی پیدا کرنی شروع کر دی تھی۔ مگر مجھے کسی کی کار میں کم ہی کبھی لفٹ ملی تھی کیونکہ میرا گھر محلے میں تھا۔ کاریں دوسری طرف جاتی تھیں۔ چودہ سال کی عمر میں میری دوستی صرف ایک لڑکے کے ساتھ رہ گئی۔ اس کی عمر سولہ سال تھی۔ مجھ سے دو کلاسیں آگے تھا۔ وہ کار پر آتا جاتا تھا۔ کار ڈرائیور چلاتا تھا۔ یہ لڑکا مجھے ہر لحاظ سے اچھا لگتا تھا۔ خوبرو بھی تھا، امیر بھی تھا، انگریزی بہت اچھی بولتا تھا۔ وہ اپنی عمر کی نسبت زیادہ جوان تھا۔ میں بھی اب بچی نہیں تھی۔ میرے جسم میں بھی نمایاں تبدیلیاں آگئی تھیں اور خیالوں میں بھی۔ یہ لڑکا میرے لئے بہت خرچ کرتا تھا۔ وہ پولیس کے ڈی۔ ایس۔ پی کا بیٹا تھا۔ اس کے ہاں پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میں اس پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ غریب میں بھی نہیں، گھر سے پیسے چرا لایا کرتی

تھی۔ جھوٹ بول کر بھی لے لیا کرتی تھی۔ میرا بڑا بھائی تو ردیوں میں کھیل رہا تھا۔ حرام کی کمائی سے وہ مجھے بہت پیسے دے دیا کرتا تھا۔ میرے اس دوست نے میرے لئے یہ سہولت پیدا کر دی کہ چھٹی کے وقت مجھے اپنی کار میں گھر کے قریب اتار جاتا۔ میں کھلے کردار کی لڑکی تھی۔ کار میرے اعصاب پر آسیب کی طرح سوار ہو گئی۔

ایک روز اس لڑکے نے مجھے انگریزی پکچر دیکھنے کی دعوت دی۔ وہ دوسرے شو میں مجھے لے جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے چند ایک اُردو فلمیں دیکھی تھیں۔ ان کے رومانی سین مجھے بہت پسند آتے تھے۔ انگریزی فلم دیکھنے کا ابھی اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ اس لڑکے نے دوسرے شو کے لئے سیٹیں بک کرالیں میں نے گھر میں جھوٹ بولا کہ سکول کے ایک فنکشن کا ریہرسل کرنا ہے جو شام چھ بجے سے رات دس بجے تک ہوگا۔ گھر والے مان گئے۔ میں پانچ بجے گھر سے نکلی اور سکول کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ چند منٹ بعد میرا دوست آگیا۔ وہ کار پر نہیں آیا تھا کیونکہ کار ڈرائیور چلاتا تھا۔ وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ یہ یورپی طرز کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ میں ایسے ہوٹل میں اس سے پہلے کبھی نہیں گئی تھی۔ وہاں کے صاف سُتھرے، سفید وردیاں پہنے ہوئے بیرے، اتنا پیارا فرنیچر اور ہر چیز کا قرینہ اور ماحول کی دلکشی دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میں نے ابھی دنیا تو دیکھی ہی نہیں، میں ابھی سکول کے اندر ہی ماڈرن بنی ہوتی تھی۔ اس ہوٹل میں جو لوگ بیٹھے ہوتے تھے وہ امیر کبیر آدمی لگتے تھے۔ میں اپنے دوست پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ میں ماڈرن نہیں ہوں۔ میں نے ایکٹنگ شروع کر دی۔

پھر ہم سینما ہال میں جا بیٹھے۔ یہ گیلری تھی۔ ہماری سیٹیں آخری قطار میں ایک کونے میں تھیں۔ پیچھے بھی دیوار اور دائیں طرف بھی دیوار تھی۔ پکچر شروع ہوتی۔ یہ رنگین تھی۔ چند ایک مناظر کے بعد فلم میں بوس و کنار شروع ہو گیا۔ ہیرو اور ہیروئن جس بے تابی سے بغلگیر ہو کر دیوانگی کے عالم میں ایک دوسرے کے منہ میں منہ ڈال دیتے تھے اس سے میرے اندر بھونچال سا آگیا۔ میں نے جسم میں پُرلطف سی حرارت محسوس کی اور پھر مجھ پر عجیب سا نشہ طاری ہو گیا۔ اس نشے میں میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور

ہماری انگلیاں ایک دوسری میں زنجیر کی طرح جکڑی گئیں۔ اُس نے چہرہ میری طرف گھمایا۔ میں نے اپنا چہرہ اُس کی طرف کیا۔ نہ اُس نے مجھے کچھ کہا نہ میں نے منہ پیچھے کیا۔

ہمارے ہونٹ ایک دوسرے سے مس کر گئے۔ اُس نے سرگوشی کی۔ "سویٹ" اب کے میں نے مُنہ اور آگے کر دیا اور ہمارے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ چپک کے رہ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ رنگدار پکچر کے رنگین الفاظ اور جوانی کو آگ لگا دینے والے مناظر میری روح میں اُترتے جا رہے تھے۔ اس پکچر میں رومان کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں شرم و حجاب اور شرافت کی حدیں پھلانگ گئی اور پکچر ہاؤس کی تاریکی میں جوان ہو گئی۔ پکچر ختم ہونے تک میری انگلیاں میرے دوست کی انگلیوں سے الجھی رہیں اور جب ہال کی بتیاں جل اُٹھیں تو مجھے یوں صدمہ ہُوا جیسے مجھے کسی نے اُس وقت جگا دیا ہو جب میں بڑا ہی حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ میرے جذباتی ابال کا یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھنا محال ہو گیا تھا۔ اگر میرا دوست آگے آگے چل نہ پڑتا اور لوگ نہ ہوتے تو میں اس کے ساتھ لپٹ جاتی اور اس کے ہونٹ اور گال اپنے دانتوں میں چبا ڈالتی۔

جی ہاں میں بے حیا ہوں۔ آپ یہی سمجھ رہے ہیں نا۔ آپ یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ایسی ننگی باتیں ایک طوائف ہی کر سکتی ہے مگر صاحب میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ جب آپ کی جوان بیٹی یا بیٹا اس قسم کی پکچریں دیکھتے ہیں جن میں صرف رومانی نہیں بلکہ جنسی اشتعال ہوتا ہے تو ان کے جذبات میں بھی اس قسم کے زلزلے بپا ہوتے ہیں جیسے میں نے بیان کر دیئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اپنی بیٹی کے متعلق اس خوش فہمی میں مبتلا رہیں کہ نہیں، وہ ایسی بے حیا نہیں ہو سکتی۔ یقین جانئے اُس کی ذہنی حالت اُس حیوان مادہ کی سی ہو جاتی ہے جو نر کی تلاش میں بھاگی بھاگی پھرتی ہے۔ اگر میری طرح اسے کوئی دوست میسر نہیں تو وہ تصوروں میں دوستانے گانٹھتی اور جنسی ابال کی تسکین کے جتن کرتی ہے اور آپ کا نوجوان بیٹا تنہائی میں اپنے آپ سے لذت حاصل کر لیتا ہے اور پاکستان میں اس قسم کی اشتعال انگیز ننگی پکچریں بھیجنے والوں کا مقصد ہی یہی ہے کہ مسلمان کی نسل کو اخلاقی لحاظ سے ختم کر دیا جائے۔ کاش میں جو دعظ آپ کو سنا رہی ہوں وہ میں

چودہ سال کی عمر میں سمجھ سکتی۔ اگر آپ جوان اولاد کے والدین ہیں تو خدا کے نام پر، پاکستان کے نام پر، اپنی آبرو کے نام پر میری باتوں کو ایک عصمت فروش کی بکواس سمجھ کر دوسرے کان سے نکال نہ دیجئے گا۔

اس پکچر کے بعد اس لڑکے کے ساتھ میری دوستی اتنی پکی ہو گئی جیسے وہ میرے جسم کا حصہ ہو۔ میرے دل میں اب یہی ایک خواہش تڑپتی تھی کہ اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھوں اور وہ اپنا مُنہ میرے مُنہ کے ساتھ لگا دے مگر تنہائی ملتی نہیں تھی سوائے سینما ہال کی تاریکی کے مگر ہال بھی لوگوں سے بھرا ہوتا تھا۔ میں دوسری بار ایک اور انگریزی پکچر اسی دوست کے ساتھ دیکھنے گئی تو میں نے گیلری میں بیٹھے ہوئے تماشائیوں کو دیکھا۔ میں نے اپنی جیسی چار اور نوجوان لڑکیاں دیکھیں۔ فیشن سے یورپین لگتی تھیں۔ ہر ایک کے ساتھ ایک ایک نوجوان لڑکا تھا۔ میں ان لڑکیوں کی حرکتیں دیکھتی رہی۔ وہ بہت شوخ تھیں۔ میں نے ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ مجھے اپنے آپ میں چند ایک خامیاں نظر آئیں۔ میرا کچا ذہن فیشن اور شو بازی کو اور انگریزوں کی طرح باتیں اور حرکتیں کرنے کو انسانیت کی معراج سمجھتا تھا۔ باپ اور بھائی کی رشوت خوری کے پیسے، مشنری سکول اور گھر والوں کے بڑا بننے کے خبط نے میری تربیت ایسے ہی خطوط پر کی تھی۔ میں نے ان لڑکیوں کو دیکھا تو ان کی نقالی کرنے لگی۔ اس پکچر میں میرا ردِ عمل وہی تھا جو پہلی پکچر کے دوران ہوا تھا۔

پھر انگریزی پکچریں مجھ پر طلسم کی طرح غالب آ گئیں اور میرا کردار انہی پکچروں کے رنگدار سانچے میں ڈھلنے لگا۔ ہم دونوں دسویں بارھویں روز پکچر دیکھنے جاتے تھے۔

سینما والوں نے جب دیکھا کہ اس قسم کی رومانی اور عُریاں فلمیں طلباء زیادہ دیکھتے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ شام کے وقت کئی لڑکے اور لڑکیاں گھر سے اجازت نہ مل سکنے کی وجہ سے نہیں آ سکتے ہوں گے۔ چنانچہ ہم جیسوں کی سہولت کے لئے انہوں نے گیارہ بجے بھی ایک شو دکھانا شروع کر دیا۔ سکول یا کالج سے کھسک جانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اکثر آوارہ طلباء اور طالبات سکولوں، کالجوں سے غیر حاضر ہونے

لگیں اور جو آوارہ نہیں تھے وہ دیکھا دیکھی آوارہ ہونے لگے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ کئی بار گیارہ بجے کا شو دیکھنے گئی۔

کار نے میری عصمت کچل دی

میرا دوست گاڑی چلانا جانتا تھا لیکن اس کا باپ اسے چلانے نہیں دیتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے سکول میں بتایا کہ اس کا باپ چند دنوں کے لئے باہر چلا گیا ہے۔ اس لے یہ پروگرام بنایا تھا کہ شام کو وہ کار لے آئے گا اور کہیں باہر چلیں گے۔ اب مجھے گھر میں پابند رکھنے والے خود آزاد ہو گئے تھے۔ رشوت کے پیسے نے سب کو ماڈرن بنا دیا تھا۔ میں شام کو سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلی۔ دوست کی بتائی ہوئی جگہ پہنچی۔ وہ کار لے آیا۔ پہلے وہ مجھے اسی ہوٹل میں لے گیا جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکی ہوں۔ وہاں ہم نے بڑا ہی پُر تکلف کھانا کھایا۔ وہاں سے نکلے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ شاید نو بج رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔

"سیر کے لئے ذرا دُور چلیں"؟

"جہاں جی میں آتا ہے لے چلو" میں نے جواب دیا۔

اور وہ مجھے وہاں لے گیا جہاں سے میں آج تک واپس نہیں آسکی۔ پندرہ سولہ سال گزر گئے ہیں جب میں اس کے ساتھ گئی تھی۔ میں اس کی کار میں بیٹھی تھی۔ کار شہر سے نکل گئی اور اس نے کار ایک ویران جگہ روک کر بتیاں بجھا دیں۔ اسے کوئی زیادہ مکالمے نہیں بولنے پڑے۔ میں اس کا مدعا سمجھ گئی۔ اس نے صرف اتنا کہا: "پچھلی سیٹ پر چلتے ہیں"۔

میرے دل پر انجانا سا خوف طاری ہو گیا۔ اس خوف میں بھی سرور سا تھا۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ وہ بھی پچھلی سیٹ پر آگیا۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا۔ مجھ میں حجاب تو رہا ہی نہیں تھا اس نے جس طرح کہا میں نے اسی طرح کیا۔ میں جھجکی نہیں، شرماتی

نہیں بلکہ میرا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے نہیں بلکہ میں اسے اسی مقصد کے لئے وہاں لے گئی تھی۔

پھر کار اُڑنے لگی۔ کھلی فضاؤں میں، بادلوں کے سفید سفید، بڑے بڑے گالوں میں کہکشاں کے راستے، کار مجھے اُس جہاں میں لے گئی جہاں سرور تھا، کیف تھا، مستی تھی۔ میں ستاروں کے دیس سے بہت آگے نکل گئی میرا دوست مجھے دنیا بھر کا حسین ترین انسان محسوس ہُوا اور پھر کار نہایت آہستہ آہستہ بڑے پیار سے کہکشاں سے اس ویرانی میں اُتر آئی جہاں کی ہر چیز تاریک تھی ——

میں عورت بن چکی تھی۔ یہی ایک حد رہ گئی تھی وہ میں نے پوری دلیری سے پھلانگ لی۔ مجھ پر ایسا نشہ طاری ہو گیا کہ میں اپنی اصلیت بھلا بیٹھی۔ میں آج سوچتی ہوں کہ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو کاروں تلے آ کے مر جاتے ہیں لیکن میں کار تلے ایسی آئی کہ جیتی ہوں نہ مرتی ہوں۔

میں جب گھر میں داخل ہوتی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ مجھ سے کسی نے بھی نہ پوچھا کہ میں اتنی دیر سے کیوں واپس آئی ہوں۔ کسی نے مجھ میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی۔ والد صاحب کو دیکھ کر مجھے ذرا بھر افسوس نہ ہوا کہ میں اس شخص کی عزت شہر سے دُور ایک ویرانے میں پھینک آئی ہوں مگر میرے گھر میں جو انقلاب آ چکا تھا اس میں میری تبدیلی کو کون محسوس کرتا۔ میرے دونوں بھائی خوش تھے کہ میں "سوشل" اور "ایڈوانس" ہو گئی ہوں۔ اس سے پہلے جب ہمارے گھر میں صرف اتنے پیسے آتے تھے جن سے باعزت دال روٹی چلتی تھی تو گھر کی شرافت اور عزت بھی قائم تھی۔ جب بالائی آمدنی سے گھر میں ہر وہ چیز آ گئی جو بڑے بڑے امیر گھرانوں میں ضروری سمجھی جاتی ہے تو میری بوڑھی ماں بھی "ایڈوانس" ہو گئی۔ وہ محلے کی عورتوں میں اپنی امیری کا پروپیگنڈہ کرنے لگی جس میں تکبر کی جھلک بھی ہوتی تھی۔ اُس وقت مجھے ماں کا پروپیگنڈہ بہت اچھا لگتا تھا۔ محلے کی پردہ نشین لڑکیاں مجھے حقیر نظر آتی تھیں مگر آج جب میں سوسائٹی کی حقیر عورت بن گئی ہوں تو مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ ماں کی وہ باتیں اوچھی تھیں اور دوسروں پر حرام کے پیسے کا رعب جمانے کی عادت کس قدر قابلِ نفرت تھی۔ مجھے آج بھی

یاد ہے کہ میری اَن پڑھ ماں ایک روز محلے کی دو عورتوں سے کہہ رہی تھی "میری بیٹی کو پولیس کے ڈپٹی کا بیٹا کار پر گھر چھوڑ جاتا ہے۔"

ماں نے مجھ سے کبھی یہ سوال نہیں پوچھا تھا کہ بیٹی تم کار کی سواری کی قیمت کیا ادا کرتی ہو؟

گھر میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ سکول میں کوئی پابندی نہیں تھی، پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میرے دوست کے گھر میں بھی رشوت آتی تھی۔ میرے گھر میں بھی رشوت آتی تھی۔ پھر کردار کیسا؟ اسلام کیسا؟ یورپ کی طرز پر چلنے والے عیسائی سکولوں میں پڑھنا اور اپنے آپ کو مسلمان کہنا اپنے ساتھ بہت بڑا مذاق ہے۔ اس رات کے بعد میں اور میرا دوست تنہا گوشوں میں ہیروئن اور ہیرو بنے رہے اور میں سہیلیوں کو اپنا رومان سنانے کے قابل ہو گئی۔ اپنا رومان سنانا بھی ایک فیشن تھا جو اب بھی ہے بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ یہ عادت لڑکیوں میں بھی ہے اور لڑکوں میں بھی۔ میں نے بڑے فخر سے اپنی سہیلیوں کو سنایا کہ میرا بوائے فرینڈ ڈی۔ ایس۔ پی کا بیٹا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ میں ڈی۔ ایس۔ پی کے بیٹے کی داشتہ ہوں۔ میں داشتہ ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ مجھے اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ کار ہاتھ لگ جاتی تو اسی ویرانے میں لے جاتا تھا جہاں ہم پہلی بار گئے تھے۔ کار نہ ہو تو ہم رات کو کسی باغ کے اندھیرے گوشے میں چلے جاتے تھے۔

ایک رات ڈیوٹی پر گشت کرتے ایک کانسٹیبل نے ہمیں موقع پر پکڑ لیا تھا اور صرف پانچ روپے دیئے تو اُس نے نہ صرف یہ مہربانی کی کہ ہمیں تھانے نہ لے گیا بلکہ ایک محفوظ جگہ بتا دی۔ ایسے دو مرتبہ ہُوا۔ مجھے اپنے جیسی ایک سہیلی نے بتایا کہ باغ کا چوکیدار اس کام کی بھی چوکیداری کرتا ہے۔ صرف پانچ روپے لیتا ہے۔ پولیس گشت پر آ نکلے تو وہ خبردار کر دیتا ہے یا پولیس کانسٹیبل کو دُور ہی گپ شپ میں لگا لیتا ہے۔ اس طرح مجھ پر ایک نئی دنیا کے گوشے بے نقاب ہوتے۔

صرف ایک طلسم رہ گیا تھا جو مجھ پر ابھی بے نقاب نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک

کلاس فیلو نے میرے سامنے رکھا۔ اس نے مجھے ایک عجیب تصویر دکھائی جس میں ایک مرد اور ایک عورت بالکل ننگے انتہائی شرمناک حالت میں تھے۔ یہ مرد اور عورت کی اس حالت سے ناواقف نہیں تھی۔ اپنے دوست کے سا میں اسی حالت میں متعدد بار رہ چکی تھی۔ پھر بھی اس تصویر نے میرے اندر آگ ل دی۔ اسی کلاس فیلو نے ایک روز مجھے اردو کا ایک ناول دیا اور کہا کہ اسے چھ کر رکھنا اور رات کو تنہائی میں پڑھنا۔ میں نے یہ کتابوں میں رکھ لیا۔ رات اپ کمرے میں پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے میری سانس اکھڑ گئی۔ گال تپنے لگے۔ مجھ نشہ طاری ہونے لگا اور میں ایک تشنگی محسوس کرنے لگی۔ اس ناول میں ایک لڑکی کو پیش کیا گیا تھا جو مختلف مردوں سے ناجائز تعلقات قائم کرتی ہے ا اپنی زبان سے اپنے تجربات انہی ننگے الفاظ میں بیان کرتی ہے جو آوارہ لڑ گلیوں میں بکتے پھرتے ہیں۔ کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ م عورت کے جنسی فعل کو تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔

میں نے رات ہی رات میں یہ ناول پڑھ ڈالا۔ میری حالت یہ ہو گئی کہ اُڑ گئی اور اپنے دوست کے پاس پہنچنے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ باقی رات گز مشکل ہو گئی۔ جی میں یہ بھی آئی کہ غسل خانے میں جا کر جسم پر ٹھنڈا پانی پھینکوں گھر والوں سے ڈر گئی۔ رات کے آخری پہر آنکھ لگی۔ صبح سکول گئی تو کلاس فیـ کو ناول واپس کر کے پوچھا کہ ایسا کوئی اور ناول مل سکتا ہے؟ اس نے کہا۔ "کونسی دنیا میں بستی ہو؟ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ ناول اور تصویریں کہاں ملتی ہیں۔ بڑی ایڈوانس بنی پھرتی ہے۔" اُس نے اسی روز ایک بک سٹال اور چھ ایک دکان دکھا دی جسے لائبریری کہتی تھی۔

آپ نے یہ لائبریریاں دیکھی ہوں گی۔ ہر محلے میں آپ کو نظر آئیں گی۔ بچوں اور بڑوں کے ناول رکھے ہوتے ہیں جو بچوں کو کرائے پر پڑھنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ یہ جرم، قتل و غارت اور جنسی لذت کے ناول ہوتے انہی لائبریریوں میں یہ ننگے ناول اور جنسی فعل کی ننگی تصویریں بھی ہوتی ہیں مال دکاندار چھپا کے رکھتے ہیں۔ ان کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے۔ لائبریریوں والے

ان ناولوں اور تصویروں کی جھلک لڑکوں اور لڑکیوں کو دکھاتے اور خوب پیسہ کماتے ہیں۔ اب ان لائبریریوں کی تعداد اور زیادہ ہو گئی ہے اور میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ نوّے فیصد بچے اور نوجوان ان لائبریریوں کے در پردہ مستقل گاہک ہیں۔

یہ ناول اور یہ تصویریں ان کا جو حشر کرتی ہیں اسے آپ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے۔ یہ مجھ سے پوچھئے۔ میں تو اس سے پہلے ہی آوارہ ہو چکی تھی، میں نے ایسی لڑکیوں کو یہ ناول پڑھ کر بدکار ہوتے دیکھا ہے جو اچھے بھلے شریف گھرانوں کی بیٹیاں ہیں۔ یہ ناول کالجوں میں ہاتھوں ہاتھ گھومتے رہتے ہیں۔ برقعہ پوش شریف زادیاں بھی یہ پڑھتی ہیں پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ شریف رہ جائیں۔ ان میں جو ذرا دلیر ہوتی ہیں، کسی نوجوان کے ساتھ دوستانہ کر لیتی ہیں اور جو حجاب کی قیدی ہوتی ہیں، وہ تصوروں میں جنسی تسکین حاصل کرتی ہیں، اور کچھ ایسی بھی ہیں جو لڑکیوں سے طریقے سیکھ کر اپنے ہاتھوں یہ آگ بجھا لیتی ہیں۔

میرا حشر دیکھ لیجئے۔ میں ایسا آئینہ ہوں جس میں آپ اپنے پورے معاشرے کا یہ ڈھکا چھپا رُخ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک لڑکی کو طوائف بنانے کے لئے کئی عناصر کام کرتے ہیں۔ میں آپ کو یہی عناصر دکھا رہی ہوں اور ثبوت کے طور پر اپنے آپ کو پیش کر رہی ہوں۔ مجھ اکیلی پر لعنت بھیج کر یا سارے ملک میں چکلے بند کر کے آپ ملک کو بدکاری سے پاک نہیں کر سکتے۔ بدکاری صرف چکلوں اور دیگر اڈوں پر نہیں ہوتی۔ نئی تہذیب کے پردے میں گھروں میں ہوتی ہے۔ کالجوں اور کیمپس میں ہوتی ہے۔ ہوٹلوں اور باغوں میں ہوتی ہے۔ کاروں میں ہوتی ہے۔ آپ کی ساتھ والی کوٹھی میں ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے آپ کی اپنی کوٹھی میں بھی ہوتی ہو۔ اگر آپ قوم میں عظمت دیکھنا چاہتے ہیں تو میں نے آپ کو جو گوشے دکھائے ہیں ان کی طرف توجہ دیجئے۔

ان گوشوں کے علاوہ میں آپ کو چند ایسے چہرے بھی دکھانا چاہتی ہوں جو قوم کے کردار کا رونا روتے رہتے ہیں، نوجوانوں کی گمراہی پر آنسو بہاتے ہیں،

لیکن یہ میں ہی جانتی ہوں کہ یہ گرمچھ کے آنسو ہیں۔ وہ عصمتوں کے محافظ نہیں خریدار ہیں۔ میں بہت سے چہرے بے نقاب کروں گی۔ میری کہانی دل اور ذہن کو صاف کر کے سُنیئے۔ میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ڈی۔ ایس۔ پی کے بیٹے کی میں اب دوست نہیں داشتہ تھی اور اس پر مجھے فخر تھا جس فضا اور ماحول میں مجھے تعلیم و تربیت ملی تھی، اس میں نمود و نمائش کو فیشن سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اپنے رومانز کے قصے اپنی سہیلیوں کو سنائے اور میرے دوست نے اپنے دوستوں کو سنائے۔ وہ کیوں نہ سناتا؟ مجھ جیسی خوبصورت گرل فرینڈ کی وہ نمائش کیوں نہ کرتا جب اس نے میری نمائش کی تو یہ اعلان تھا کہ میں چل نکلی ہوں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ چھٹی کے وقت ایک دو شہزادے سکوٹر یا کار لا کے میرے راستے میں کھڑے ہو جاتے اور لفٹ پیش کرتے۔ میں وہ عورت تو تھی ہی نہیں جس کے متعلق شاعروں نے کہا ہے، دل مگر دیتی ہے عورت ایک بار۔ وہاں دل کا تو مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں ان کی لفٹ ٹھکرا دیتی تھی جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں ایک لڑکے کو دل دے بیٹھی تھی بلکہ لفٹ ٹھکرانے میں مجھے لطف آتا تھا، فخر محسوس ہوتا تھا اور میں انہیں یہ جتانا چاہتی تھی کہ میں اتنی سستی لڑکی نہیں ہوں جو صرف لفٹ کے لالچ میں تمہارے ساتھ چل پڑوں گی۔ میں دراصل اپنی قیمت مقرر کر رہی تھی۔

ایک نیا دوست مجھے ہوٹل کے تہہ خانے میں لے گیا

ایک روز ایک لڑکی مجھ سے الجھ پڑی۔ بظاہر بات کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ ذرا ذرا سی بات پر مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ میری کلاس فیلو تھی۔ آخر بات یہ کھلی کہ مجھ سے پہلے یہ میرے دوست کی دوست تھی اور جب اس نے مجھے اپنی داشتہ بنا لیا تو اسے ٹھکرا دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ میرا دوست دو اور لڑکیوں کا بھی دوست ہے۔ میں نے اس سے شکایت نہیں کی۔ دوسرے ہی دن میں نے اس جیسے ایک کار والے ایک نوجوان کی لفٹ قبول کر لی۔ پھر وہی سلسلہ اس کے ساتھ چل پڑا جو پہلے دوست کے ساتھ چلتا تھا۔ اس نے یہ کرم کیا کہ مجھے میٹرک میں پاس کرا دیا اور میں ایک ایسے کالج میں داخل ہو گئی جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ وہاں داخلہ کسی خوش قسمت کو ہی ملا کرتا ہے لیکن والد صاحب اور بھائی نے داخلہ دلوا دیا۔

میرا دوسرا بھائی کالج کے آخری سال میں تھا۔ رشوت کے زور پر اب ہمارا شمار امیروں اور ماڈرن لوگوں میں ہوتا تھا۔ میرا بھائی شہزادہ بن گیا تھا۔ اس میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں انہیں میں بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جن راہوں پر وہ چل نکلا ہے، ان راہوں پر اس کی چھوٹی بہن کتنی منزلیں طے کر چکی ہے۔ مجھے اب گھر سے پیسے چرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بڑا بھائی بغیر مانگے دے دیتا تھا۔ وہ نہ بھی دیتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کالج میں میری راہ میں پیسے اور تحفے نچھاور کرنے والے بہت تھے۔ اس کالج میں رشوت خور افسروں، سرگودھے اور لائل پور کے زمینداروں اور جاگیرداروں، سرحد کے خان صاحبوں، وزیروں اور بڑے بڑے کارخانہ داروں کے بیٹوں

کی کمی نہیں تھی۔ مشنری سکول نے مجھے بڑے کام کے گُر سکھا دیئے تھے۔ لڑکے میری ہر ایک ضرورت پوری کرتے تھے۔ گھر والوں نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ میرے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں اور زیبائش کا سامان میں کہاں سے خرید لاتی ہوں۔

اب میں اتنی تجربہ کار ہو چکی تھی کہ ان تحفوں، ہوٹلوں اور پکچروں کی دعوتوں کے عوض کسی کو اپنا جسم پیش نہیں کرتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ ہر ایک کو "صرف تمہاری ہوں" کا چکمہ دیئے رکھتی تھی اور اس کے ثبوت میں ہونٹوں سے ذرا ہونٹ لگا دیتی یا ذرا سی دیر کے لئے گلے لگ جاتی تھی۔ اس طرح میرے امیدوار تحفوں کی شکل میں بڑھ چڑھ کر قیمت پیش کرتے تھے۔ صرف میں ہی نہیں کئی لڑکیاں ان شہزادوں کی تحفہ بازی اور عشق بازی کا نشانہ بنی ہوتی تھیں اور وہ لڑکوں کو تھوڑی تھوڑی رومانی تفریح کرا کے ان سے خوب کھاتی تھیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آج کے دَور میں جو لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہیں، وہ رومان بازی نہیں کرتیں تو میں اس آدمی کو اندھا اور خود فریبی کا شکار کہوں گی۔

اس دوران پاکستان ترقی کے اُس مرحلے میں داخل ہو گیا جہاں بڑے شہروں میں یورپی طرز کے وہ ہوٹل کھل گئے جو غالباً ہمارے ملک کے قانون سے آزاد ہیں ورنہ اسلامی مملکت میں ایسے ہوٹل کبھی نہ کھلتے۔ ان ہوٹلوں میں مغربی طرز کے ڈانس شروع ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی چند ایک دیسی طرز کے شریفانہ ہوٹلوں نے بھی اپنی طرز بدل دی اور یورپی ہوٹلوں کے طور طریقے اختیار کر لئے۔ ان ولایتی اور دیسی ہوٹلوں میں تہہ خانے بن گئے جہاں پاکستانی لڑکیوں اور لڑکوں کو ولایتی ڈانس سکھائے جانے لگے۔ یہ تو سب جانتے ہوں گے کہ یہ ڈانس مرد اور عورت باہوں میں باہیں ڈال کر اور سینے سے سینہ ملا کر ناچتے ہیں۔ اس ڈانس میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی کہ آپ اپنے دوست کے ساتھ ہی ناچیں گے۔ کسی بھی عورت کو کوئی بھی مرد اپنی باہوں میں لے کر ناچ سکتا ہے۔ انکار کو بدتہذیبی سمجھا جاتا ہے۔ آپ ان ہوٹلوں میں جائیں تو پاکستانی مسلمانوں کو دیکھیں گے کہ بیوی اپنے خاوند کے سامنے کسی اور کے ساتھ چپکی ہوئی ناچ رہی ہے اور خاوند

کسی اور کی بیوی کو سینے سے لگائے ہوتے ہے۔

میں سیکنڈ ایئر میں تھی جب میرا ایک امیرزادہ دوست مجھے پہلی بار ایک یورپی ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں میں نے اپنے جیسی کتنی لڑکیاں دیکھیں جو پاگلوں کی طرح مردوں کے ساتھ ناچ رہی تھیں۔ سگریٹ پی رہی تھیں اور چیخ چیخ کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ آپ یقین کریں کہ میں نے پہلے روز چار لڑکیوں کو دیکھا جو دھما چوکڑی اور بوسہ بازی کے بعد جانے لگیں تو برقعے اوڑھ کر گئیں۔ یہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں تھیں جو جھوٹے بہانے تراش کر وہاں گئی ہوں گی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان میں ہوسٹلوں میں رہنے والی لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ میں وہاں گئی تو کئی نوجوان میری طرف بڑھے۔ وہاں بیس کے قریب امیرزادے تھے۔ کمرہ بدبو سے بھرا ہوا تھا۔ اتنی ہی تعداد لڑکیوں کی تھی۔ پہلے روز آٹھ نوجوانوں نے مجھے باری باری اپنی باہوں میں لے کر ڈانس کے ابتدائی قدم سکھائے۔ مجھے جو دوست ساتھ لے گیا تھا وہ ایک اور لڑکی کے ساتھ ہنس کھیل رہا تھا۔

میرا دوست میرے پاس آیا اور مجھے ایک سگریٹ سلگا کر دیا۔ میں نے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ دو تین لڑکیاں میرے ارد گرد آن کھڑی ہوئیں۔ میرے دوست نے مجھے کان میں کہا، "انکار نہ کرنا اور انگریزی میں باتیں کرنا۔"

میں نے سگریٹ کا کش لگایا تو سر چکرا گیا۔ کھانسی بھی آئی۔ ادھر سے کسی نے میرے ہاتھ میں کوکا کولا کی ایک بوتل دے دی۔ لڑکیوں کی حوصلہ افزائی پر میں نے ایک اور کش لگایا۔ دھواں اتنا بدبودار تھا کہ مجھے متلی آنے لگی۔ پھر ان سب کے اصرار پر کوکا کولا کے چند گھونٹوں کے ساتھ میں نے چند اور کش لگائے اور ذرا سی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری دنیا کی مسرتیں میرے سینے میں سمٹ آئی ہیں اور میں اُڑ رہی ہوں۔ بدبو نہ رہی، متلی نہ رہی، جی میں ایک ہی بات آئی کہ ناچوں اور ناچتی ہی رہوں۔ دوسری لڑکیوں اور لڑکوں نے بھی سگریٹوں کے کش لگائے۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھواں اندر لے جاتے تھے اور کچھ دیر بعد مُنہ اور ناک سے نکالتے تھے۔

سگریٹ نوشی کے بعد محفل میں نیا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ مغربی موسیقی کے ریکارڈ بج رہے تھے اور ہم ناچ رہے تھے۔ اتنے میں ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔ "سگریٹ نے موڈ ٹھیک کر دیا ہے نا؟"

مجھے کچھ شک سا ہوا۔ میں نے پوچھا۔ "سگریٹ میں کیا تھا؟"

اس نے بتایا سگریٹ میں چرس تھی۔ مجھے چرس سے پیار ہو گیا۔ اس نے مجھے طلسماتی دنیا دکھا دی تھی جو میں خواب میں بھی نہ دیکھ سکتی۔ میں نے دل ہی دل میں والد صاحب کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے مجھے اُس سکول میں داخل کرایا تھا۔ پھر اپنے بڑے بھائی کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے ماں باپ کو قائل کرایا تھا کہ ہم ایڈوانس لوگ ہیں اس لئے لڑکی کو پردے میں نہ بٹھاؤ اور میں نے اُس لڑکی کا شکریہ ادا کیا جس نے مجھے وہ ناول دیا تھا اور مرد عورت کے جنسی اختلاط کی تصویریں دکھائی تھیں اور میں اُس دوست کی تو احسان مند تھی جس نے مجھے کار میں شہر سے دور ویرانے میں لے جا کر میرے سامنے سے وہ چٹان جسے شرم اور جھجک کہتے ہیں دُور کر دی تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی دھما چوکڑی کے بعد میرے دوست نے مجھے اس سگریٹ کے دو تین کش اور لگوائے جو وہ خود پی رہا تھا۔ نشہ بڑھ گیا۔ اس نے میرا بازو اپنے بازو میں لے لیا اور ذرا پرے لے جا کر ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں گدّے والا پلنگ بچھا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور ذرا سی دیر بعد ہم پلنگ پر لیٹے ہوتے تھے۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں تو چاہتی ہی یہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ اس ہوٹل میں ہر ایک انتظام موجود ہے۔

پھر میری شامیں اس ہوٹل کے تہہ خانے میں گزرنے لگیں۔

پھر میں وہاں کسی دوست کے بغیر چلی جاتی اور وہاں مجھے دوست مل جاتے۔

یہ ہوٹل ایسے ہیں کہ وہاں کوئی روپے پیسے والا ہی چائے کی پیالی پی سکتا ہے۔ میں حیران ہُوا کرتی تھی کہ پاکستان میں اتنی دولت کہاں سے آ گئی ہے۔

ایک طرف جھگیاں بنتی اور پھیلتی چلی جا رہی تھیں اور دوسری طرف ایک ایک دو دو کنال اور ایکڑ ایکڑ وسعت میں محلوں جیسی کوٹھیاں بن گئی تھیں۔ لوگ دو نوالے روٹی کے پیچھے پیدل بھاگتے دوڑتے نظر آتے تھے اور مشقت کے مارے ہوئے اس نیم فاقہ کش ہجوم میں سے کاریں زناٹوں سے گزر جاتی تھیں۔ سوسائٹی غریب اور امیر میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایسے غریب اور مزدور ملک میں اس قسم کے یورپی ہوٹل جہاں دولت پانی کی طرح بہتی تھی، عوام کی غربت کا مُنہ چڑاتے تھے، مگر یہ میں آج کہتی ہوں اُس وقت جب میں ان ہوٹلوں میں مردوں سے بغل گیر ہو کر ناچا کرتی اور نشے والے سگریٹ پیا کرتی تھی، میں اپنے آپ کو پاکستانی کہلاتے شرمایا کرتی تھی۔ وہاں اب یورپ اور امریکہ کے امیرزادے بھی آنے لگے تھے۔

ایک روز ایک امریکی نے مجھے اپنے ساتھ ڈانس کرایا۔ میں انگریزی خوب بول لیتی تھی۔ وہ میری شکل و صورت، قد بُت اور زبان سے بہت متاثر ہوا اور میں اس سے صرف اس لئے متاثر ہوئی کہ وہ امریکی تھا۔ میرے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ اس نے مجھے اعلیٰ قسم کی شراب پلائی۔ پھر مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس نے میرے جسم کے ہر حصّے کی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ اگر میں اس کے ساتھ شادی کر لوں تو وہ مجھے امریکہ لے جائے گا۔ میں کچھ فیصلہ نہ کر سکی۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ شادی شدہ ہے لیکن اس کی بیوی بالتو فی اور بھدی سی عورت ہے۔ اس طرح مجھے آسمان پر چڑھا کر وہ مجھے اُس پستی میں لے گیا جس میں آج پڑی ہوئی ہوں۔ اس کے ساتھ اس کے نرم و گداز پلنگ پر کچھ وقت گزار کر میں نے فخر محسوس کیا تھا۔ میں آپ کو حقیقت بتاتی ہوں کہ پاکستانی لڑکیاں اور عورتیں یورپ اور امریکہ کے مردوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔

میں کنواری ماں بننے والی تھی

میرا دوست مجھے اس قسم کے دیسی ہوٹلوں میں بھی لے جانے لگا۔ پاکستان کی نئی نسل اب جوق در جوق ان ہوٹلوں میں جانے لگی تھی۔ ان میں یورپ کے آوارہ نوجوان بھی ہوتے تھے جنہیں آپ ہپی کہتے ہیں۔ ان میں چند ایک تہذیب یافتہ اور شائستہ قسم کے غیر ملکی بھی ہوتے تھے جو ہمارے ساتھ چرس پیتے، ناچتے اور ہر قسم کی بدتمیزی میں ہمارا ساتھ دیتے تھے۔ ہم اپنے آپ کو یہ فریب دیا کرتے کہ جو کام امریکہ کے مہذب لوگ کرتے ہیں وہ بُرا نہیں ہو سکتا۔ انگریزی تعلیم نے ہمارے ذہنوں کو انگریزی بولنے والی قوم کا غلام بنا رکھا تھا۔ ہم اپنے آپ کو ان پاکستانیوں سے برتر سمجھتے تھے جو ہماری طرح ماڈرن اور ایڈوانس نہیں تھے مگر ٹھوکریں کھا کر یہ راز کھلا کہ ہم کمتری کی پستیوں میں رہتے تھے۔ میں آج محسوس کرتی ہوں کہ یہ جو غیر ملکی ہپی اور بظاہر شائستہ امریکی ہمارے ساتھ ناچا کودا کرتے تھے۔ اسی مقصد کے لئے یہاں بھیجے گئے تھے کہ پاکستان کی نئی نسل کو ذہنی، اخلاقی اور قومی لحاظ سے تباہ کر دیں اور بدکاری کے ایسے جراثیم پھیلائیں کہ نوجوان اپنے آپ کو مسلمان اور پاکستانی نہ سمجھیں۔

میں اخباروں میں پڑھا کرتی تھی کہ ہماری نئی نسل مغرب کے رنگ میں رنگی گئی ہے اور بے حیائی وبا کی طرح پھیل رہی ہے۔ مسجدوں کے لاؤڈ سپیکروں کی چیخ و پکار بھی بڑھتی جا رہی تھی اور اسی رفتار سے نئی پود میں بے حیائی اور آوارگی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم نوجوان لڑکیاں امیرزادوں کی کاروں میں چیخ چیخ کر قہقہے لگاتی قوم کی نظروں کے سامنے سے زناٹے سے گزر جایا کرتی تھیں مگر ہمیں کسی نے کبھی روکا نہ تھا۔ کسی نے کبھی ٹوکا نہ تھا۔

اب جا کے ان ہوٹلوں میں دیکھو۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں ہماری نئی نسل چرس، شراب، ہپی ازم، ناچ، ہلڑبازی اور بدکاری میں تباہ ہو رہی ہے۔ اگر وہاں آپ پاکستان کے ان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھیں تو آپ یہی کہیں گے کہ یہ پاکستانی نہیں۔ یہ سمندر پار کی کوئی جنگلی نسل ہے جو اتنے قیمتی کپڑے پہن کر ہمارے ملک میں اخلاقی تباہی پھیلانے کے لئے آگئی ہے۔ یہ ہماری نئی نسل ہے جو پاکستان میں ہی امریکن بن گئی ہے۔

میں آپ کو ان لڑکیوں کے راستے پتے نہیں بتا سکتی جو امریکن بن کر آج پاکستان کی سڑکوں پر اور نہ جانے کہاں کہاں ذلیل و خوار ہوتی پھر رہی ہیں۔ میں اپنی سنا سکتی ہوں۔ اس میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھوں گی۔ میں تھرڈ ایئر میں دو بار فیل ہوئی جس کا مجھے کوئی غم نہ تھا۔ میں ابھی کالج میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ میرے رشتے کے لئے پیغام آنے لگے۔ مجھے ان میں سے ایک بھی پسند نہیں تھا کیونکہ میں آزاد رہنا چاہتی تھی۔ والد صاحب کو ایک گھرانہ پسند آگیا اور انہوں نے بات پکی کر دی۔ میں نے ماں سے صاف کہہ دیا کہ میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔ ان لوگوں نے یہ شرط بھی عائد کی تھی کہ لڑکی پردے میں بیٹھے گی۔ اپنے امیدوار کو میں جانتی تھی کہ شریف آدمی ہے۔ میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ البتہ اس گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ ایک روز میں نے یہاں تک ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے امیدوار کو راستے میں کہیں روک لوں گی اور اسے کہہ دوں گی کہ جناب، کوئی اپنے جیسا رشتہ ڈھونڈ لیں اور مجھے معاف کریں مگر میرے سارے ارادے خاک میں مل گئے۔

میں اپنے آپ کو تمام بندھنوں سے آزاد سمجھتی تھی اور یہ بھول ہی گئی تھی کہ انسان قدرت کے قانون کا قیدی ہے۔ یہاں خطا کی سزا بھی ملتی ہے۔ اس سزا کا مجھے احساس اس روز ہوا جس روز مجھے بڑی زور کی ابکائی آئی۔ جی اتنا متلایا کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ میں نے اپنے جیسی ایک سہیلی سے بات کی تو اس نے کہا ”میں نے تمہیں کتنی بار کہا تھا کہ احتیاط کرنا۔ میرا خیال تھا کہ تم بچی نہیں ہو۔ کچھ احتیاط تو ضرور کر رہی ہوگی۔“

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہوٹلوں میں جمع ہونے والی تین چار تجربہ کار

لڑکیوں نے مجھے خبردار کیا تھا کہ نشے میں کہیں اندھی نہ ہو جاؤں۔ انہوں نے گولیاں بتائی تھیں اور دو اور طریقے بھی بتاتے تھے۔ میں ان پر عمل کرتی رہی مگر میرا ایک دوست بہت ہی خودسر اور وحشی تھا۔ وہ کسی احتیاط کی پروا نہیں کرتا تھا۔

یہاں میں آپ کو اپنے معاشرے کی ایک اور بدعت بتا دیتی ہوں۔ ہمارے ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کی کھلم کھلا پبلسٹی نے بدکاری میں بہت اضافہ کیا ہے۔ غیر شادی شدہ لڑکی کو ماں بننے کا خطرہ بدکاری سے باز رکھتا ہے مگر سرکاری طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے جو مراکز کھول دیئے گئے ہیں وہاں سے کوئی بھی لڑکی اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کر کے احتیاط کا سامان اور ہدایات لے سکتی ہے۔ احتیاطی تدابیر کا ذکر سرکاری اشتہاروں میں اور لٹریچر میں بہت زیادہ ہوتا ہے اور دوا فروشوں کی دکانوں پر ضروری دوائیوں اور سامان کی اتنی کھلی نمائش ہوتی ہے کہ اب نوجوان لڑکیاں بھی یہ چیزیں خریدنے میں جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے سرکاری مراکز میں کام کرنے والی عورتیں مجھ جیسی لڑکیوں کو یہ سامان چوری چھپے لا کر دیتی اور پیسے کماتی ہیں۔

ہم جو لڑکیاں ہوٹلوں میں یا راتوں کو دوستوں کے ساتھ کاروں میں شہر سے دور جایا کرتی تھیں، ایسا سامان اپنے ساتھ رکھا کرتی تھیں، مگر دو چار بار نشے میں اور اپنے دوست کی بے صبری کی وجہ سے احتیاط نہ ہو سکی جس کا نتیجہ میرے سامنے آگیا۔ میری سہیلی نے مجھے گولیاں دیں۔ اپنے دوست کو بتایا تو اس نے دوا انجکشن کرا دیے۔ ان دوائیوں کا صرف یہ اثر ہوا کہ دل ڈوبنے لگتا اور چکر آنے لگتے تھے۔ میری اندر کی حالت نہ بدل سکی۔ وقت مختلف دوائیاں استعمال کرنے میں ضائع ہو گیا۔ میرے دوست نے مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کا پتہ دیا۔ وہ خود ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ آپریشن میں جتنا خرچ آئے گا وہ خود دے گا۔ پیسوں کی تو میرے پاس کمی نہیں تھی۔ میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ اس کا حال حلیہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی پہلو لیڈی ڈاکٹر نہیں۔ اس

نے شاید میرے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ میں کیوں اس کے کلینک میں داخل ہوئی ہوں۔ مجھ جیسی کئی اس کے ہاتھوں سے نکل چکی ہوں گی۔ مجھے دیکھ کر یوں مسکرائی جیسے مجھے پہلے سے جانتی ہو۔

میں نے ذرا جھجک کر اور قدرے ہکلا کر بات کی تو اس نے شگفتہ سے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھ گئی ہوں۔ تم بن بیاہی ماں بننے والی ہو۔ شادی شدہ تو نہیں ہو؟"

میں نے کہا "نہیں"۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دو تین منٹ بعد باہر آئی اور بولی "ڈاکٹر صاحب ایسا کام کیا نہیں کرتے۔ میں نے انہیں راضی کر لیا ہے۔ وہ جیسے کہیں ویسے کرنا۔ اگر بگڑ گئے تو انکار کر دیں گے۔ تم جانتی ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ذرا سی دیر کی تکلیف ہوگی۔"

میں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اُس نے مجھے اپنے قریب سٹول پر بٹھا کر میرے پیٹ کو دبا کر دیکھا اور پوچھا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ میں نے بتایا کہ ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے ڈانٹے گا اور وعظ شروع کر دے گا لیکن اس نے بڑے پیار سے کہا "تمہاری خوبصورتی اور جوانی پر ترس آتا ہے، ورنہ میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔ یہ جرم ہے۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو میں جیل چلا جاؤں گا۔"

"تو کیا اس میں جان کا خطرہ ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"بالکل نہیں"۔ اس نے کہا۔ "صرف پانچ منٹ لگتے ہیں۔ ذرا سی تکلیف ہوگی۔ پھر یوں محسوس کرو گی جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں تھا۔ میں ڈرتا اس لئے ہوں کہ یہ کام قانون کے خلاف ہے۔"

میں نے جھجک کر اس کے گھٹنے پکڑ لئے اور میرے آنسو نکل آئے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں منت سماجت کرتی رہی۔ اس نے اُٹھ کر اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور مجھے ایک پردے کے پیچھے لے جا کر دیوان پر لٹا دیا۔ کہنے لگا۔ "میں ذرا معائنہ کر لوں۔ پھر کچھ بتاؤں گا۔" اس نے اپنے ہاتھوں میری شلوار کھول کر نیچے کر دی۔ میں اسے معائنہ سمجھتی رہی۔ اس نے کہا۔ "پانچ سو روپے

دے سکتی ہو؟ ابھی دے سکو گی؟"

"ابھی تو نہیں دے سکوں گی"۔ میں نے کہا اور ذرا جھجکتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا۔ "پانچ سو خاصی زیادہ رقم ہے۔"

"نہیں دے سکو گی؟"

"دو تین قسطوں میں آسانی سے دے سکوں گی۔"

"میں علاج بھی تو دو تین قسطوں میں ہی کروں گا۔" اس نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔ "تم بذاتِ خود پانچ ہزار روپے کی فیس ہو۔ میں نے تو اپنی فیس صرف بتائی ہے۔ مانگی تو نہیں۔ پریشان نہ ہو۔ اتنی حسین لڑکی کو میں تباہ نہیں ہونے دوں گا۔"

پھر اس نے اتنی پیاری باتیں کیں کہ میری ساری گھبراہٹ دُور ہو گئی۔ اس نے میرا حوصلہ بڑھا دیا اور ہنس کر بولا۔ "فیس کی پہلی قسط وصول کر لیتا ہوں۔" میں ابھی لیٹی ہوئی تھی اور شلوار باندھی نہیں تھی۔ اس نے دیوان پر چڑھ کر مجھ سے وہ فیس وصول کر لی جو میرے لئے نئی بات نہیں تھی۔ میں نے اسے روکا نہیں۔ میں مصیبت میں مبتلا تھی۔ میں نے بُرا بھی نہیں مانا۔ اس نے مجھے ایک گولی کھلا دی۔ ایک رات کو کھانے کے لئے دی اور کہا۔ "کل اسی وقت آجانا۔"

دوسرے دن گئی۔ اُسی دیوان پر لٹا کر اس نے پھر معائنے کے بہانے میری شلوار نیچے سرکا دی اور ایک اوزار سے معائنہ کیا۔ پھر میرا حوصلہ بڑھایا اور ہمدردی کی باتیں کرتے کرتے وہ مسیحا سے شیطان بن گیا اور میرے جسم سے فیس کی ایک اور قسط وصول کر لی۔ اس نے مجھے ایک انجکشن دیا اور اگلے روز پھر آنے کو کہا۔ مسلسل چھ روز اس نے میرے ساتھ بدکاری کی اور کہا کہ ایک انجکشن نہیں رہا۔ کل کہیں نہ کہیں سے تلاش کر لوں گا۔ میں رو پڑی اور اس کے پاؤں پکڑ کر منت کی کہ کوئی علاج کرے۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ وہ میرے ساتھ کھیلنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرے گا۔ میں نے اُس شام اپنے دوست سے بات کی تو اُس نے بے رُخی برتی۔ میں نے کہا۔ "یہ تمہاری کرتوت ہے اور یہ تمہاری

ذمہ داری ہے۔ اب بھاگو نہیں۔"

"یہ صرف میری کرتوت نہیں۔" اس نے بگڑ کر کہا۔ "اور جس جس کے ساتھ کاروں پر جاتی رہی ہو اُن سے بھی پوچھ لو کہ تمہارے پیٹ میں کس کی کرتوت رنگ لے آئی ہے۔" اور وہ پرے چلا گیا۔

میری ماں بھانپ گئی اور وہ سمجھ گئی کہ بیٹی کاروں کی سواری کی کیا قیمت ادا کر رہی ہے۔ شاید اس نے دل میں اعتراف کر لیا تھا کہ مجھے اس حال تک پہنچانے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ اس نے مجھ سے ایک دو باتیں پوچھیں جو میں نے بتا دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔ "جہاں رشتہ دیا ہے وہاں دن مقرر کر دو۔ کوشش کرو کہ تین چار دنوں تک شادی ہو جائے۔"

پندرہ دنوں کی سہاگن

یہ میرا دہی امیدوار تھا جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ میرے گناہوں نے مجھ سے ہتھیار ڈلوا دیئے اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اس آدمی کی ہر شرط قبول کروں گی۔ برقعہ پہنوں گی۔ پردے میں بیٹھوں گی۔ باورچی خانے میں قید ہو جاؤں گی اور مغرب کے کلچر کے حسین فریب پر لعنت بھیجوں گی۔ میرے دوست نے اور اس ڈاکٹر نے مجھے اس جھوٹی چکاچوند سے متنفر کر دیا تھا۔ میرے گناہوں نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ میری ماں نے میرا یہ فیصلہ سُنا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے میرے والد صاحب کو اصل بات تو نہ بتائی، یہ خوشخبری سنائی کہ میں شادی کے لئے راضی ہو گئی ہوں۔

والد صاحب نے فوراً جا کر دن مقرر کر دیئے۔ میں چاہتی تھی کہ اُسی روز بارات آ جاتے مگر دسویں روز آئی۔ مجھے ایسی گولیاں مل گئی تھیں جن سے ابکائیاں رُک گئی تھیں۔ میں یہ دس روز گھر سے نہیں نکلی، میں چرس، ہیروئن اور شراب کی بھی نشئی ہو گئی تھی۔ آوارگی اور عیاشی بھی نشے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ نشے چھوٹتے نہیں لیکن میں نے جو تجربہ کیا ہے، وہ بہت ہی مختلف ہے۔ میں نے گھریلو زندگی میں واپس آ جانے کا تہیہ کر لیا اور باہر نہ گئی۔ خالی سگریٹ تک نہ پیا تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے مزاج میں کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ محض ارادہ تھا اور نیت کی پختگی، میں نے جو ٹھوکر کھائی تھی وہ مجھے راہ پر لے آئی مگر ایک یہ ڈاکٹر تھا جو سیدھے راستے کی چٹان بن گیا۔ اگر وہ میرا کیس لینے سے انکار کر دیتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ اس نے مجھے فریب دیا اور میری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ سینے میں انتقام کا شعلہ بھڑکتا تھا جو مجھے ہی جلا کے سرد ہو جاتا تھا۔ ایک بار میں نے یہ بھی سوچا کہ ڈاکٹر کے

گھر کا پتہ معلوم کر کے اس کی بیوی کو جا کے بتاؤں کہ تمہارا خاوند ڈاکٹر نہیں ڈاکو ہے، عصمتوں کا لٹیرا ہے مگر میرے اپنے گناہ مجھے شرمسار کر کے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیتے تھے۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ مجھ جیسی کتنی گناہ گار لڑکیاں مسیحائی کے جال میں جا پھنسی ہوں گی۔

ان دس دنوں میں مجھے جو سوال پریشان کرتا رہا وہ یہ تھا کہ اپنے خاوند کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دوں؟ اور قرآن ہاتھ میں لے کر اسے یقین دلاؤں کہ میں شریف اور وفادار بیوی بن کر دکھاؤں گی؟ یہ تو میں نے دل میں قسم کھا لی تھی کہ میں شریف پردہ نشین اور وفادار بیوی بنوں گی، مگر مجھ میں اعتراف گناہ کی جرأت نہیں تھی اور میں ایسی جرأت کے نتائج سے ڈرتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ کیا میرا گناہ جو میری کوکھ میں پرورش پا رہا تھا چھپا رہ سکے گا؟ میرے ارادے اور میری قسم اس کچے دھاگے سے لٹک رہی تھی۔ میرا کوئی ہمراز نہ تھا۔ ماں میری حالت پہچان گئی تھی مگر اس سے میں نے کوئی مشورہ نہیں لیا نہ اس نے اس کے متعلق کوئی بات کی۔

پھر وہ رات آئی کہ میں حجلۂ عروسی میں بیٹھی دولہا کے انتظار میں تھر تھر کانپ رہی تھی اور میرے آنسو بہے جا رہے تھے اور جب دولہا کمرے میں داخل ہوا

تو اقبالِ جرم کی جو ذرا سی ہمت باندھی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ ایک ایک لمحہ گھنٹے گھنٹے جتنا طویل تھا۔ مجھے دکھ یہ ہو رہا تھا کہ یہ شخص مجھے نئی نویلی کنواری دلہن سمجھ رہا تھا۔ میں اس کے لئے کتنا بڑا فریب بنی ہوئی تھی، لیکن میں ایسا حسین فریب تھی کہ وہ کچھ بھی نہ جان سکا۔ اس میں میری ایکٹنگ کا کمال بھی تھا اُسے ذرا بھر شک نہ ہوا کہ میں ایسی کتنی شادیاں کاروں میں، ہوٹلوں کے ٹھنڈے کمروں میں اور باغوں کے تاریک گوشوں میں کر چکی ہوں۔ میری ازدواجی زندگی کی پہلی صبح طلوع ہوئی تو دولہا نے ایسی بھولی بھالی باتیں کیں جن سے میں جان گئی کہ بے چارہ سیدھا سادا آدمی ہے اور اسے مجھ پر کوئی شک نہیں ہوا۔

اس کی عمر اٹھائیس سال کے قریب تھی اور میں اس کی زندگی میں پہلی لڑکی

تھی۔ میری عمر بائیس سال تھی اور وہ میری زندگی میں پہلا مرد نہیں تھا۔ میں جو کچھ جانتی تھی اس کا اسے عشرِ عشیر بھی معلوم نہیں تھا۔ مجھے اس کی سادگی پر ترس آیا، اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ شخص یا تو اتنا سادہ ہے کہ عورت کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا یا اسے میرے ساتھ اس قدر شدید محبت ہے جس نے اس کی زبان اور آنکھیں بند کر دی ہیں۔ دونوں میں سے جو بھی صورت تھی مجھے یہ آدمی اس قدر پیارا لگا کہ میں نے تمام عمر اس کی غلامی میں، اس کے حکم اور خواہشات کے مطابق گزارنے کا پختہ عزم کر لیا۔ میں نے اس میں جو خلوص اور بے ساختگی دیکھی اس کی لذت سے میں ناآشنا تھی۔ خدا کی قسم مغرب کی بے حیا تہذیب میں مجھے ایک لمحے کے لئے بھی ایسی روحانی لذت نہیں ملتی تھی۔ وہاں جو کچھ تھا اور جو کچھ ہے اس کا تعلق جسم تک محدود ہے۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ برقعوں میں لپٹی ہوئی وہ سیدھی سادی لڑکیاں جو ایک خاوند کی ہو کے رہ جاتی ہیں، کتنی خوش نصیب ہیں۔ میں انہیں حقیر سمجھا کرتی تھی لیکن وہ عظیم ہیں۔

میرا دولہا میری محبت میں اور میری خوبصورتی میں ایسا اندھا ہوا کہ اسے میری اندرونی حالت کا بالکل پتہ نہ چلا۔ اسے شک تک نہ ہوا کہ میں جس پہلے بچے کو جنم دوں گی، اس کا باپ وہ نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مجھے بھی علم نہیں تھا کہ اس بچے کا باپ کون ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال مجھے لہو کے آنسو رلاتا تھا کہ میں ساری عمر اپنے اتنے پیارے خاوند کو ایک دھوکے میں ڈالے رکھوں گی اور یہ دھوکہ میرے ضمیر میں کانٹے کی طرح اترا رہے گا، مگر خدا نے میرے خاوند کو اس دھوکے سے جلدی ہی آزاد کرا دیا۔ وہ اس طرح کہ شادی کے تیسرے چوتھے روز ہی میری ساس اور میرے دولہا کی ایک خالہ بھانپ گئیں کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میری حالت کے علاوہ ان کے پاس یہ ثبوت بھی تھا کہ میرے والد صاحب نے اچانک بڑی عجلت میں دن مقرر کیا تھا۔ اس سے پہلے میرے سسرال والے دو بار دن مقرر کرنے میرے گھر گئے تھے لیکن والد صاحب اور میری ماں نے ٹال دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میں رضامند نہیں ہو رہی تھی۔ اب میری حالت دیکھ کر انہیں شک ہوا کہ دن اتنی جلدی جو مقرر کیا گیا تھا، اس

کی وجہ یہ تھی کہ میں باہر کہیں جھک مار چکی ہوں۔

میری ساس نے ایک بوڑھی اور تجربہ کار دائی کو بُلا لیا۔ اس نے مجھے اچھی طرح دیکھا۔ اگر وہ اکیلی ہوتی تو میں اسے مُنہ مانگی رشوت دے کر اپنی مرضی کی بات کہلوا لیتی اور بچّے کی پیدائش کے وقت دائی کو مزید رقم دے کر کہلوا لیتی کہ بچہ سات ماہ کا پیدا ہوا ہے مگر ساس میرے کمرے میں سر پر کھڑی رہی۔ دائی نے مجھے دیکھ کر عجیب سی نظروں سے میری ساس کی طرف دیکھا۔ دونوں باہر نکل گئیں۔ ساس نے مجھے کچھ بھی نہ کہا۔ رات کو خاوند میرے کمرے میں نہ آیا۔ دوسرے دن میرے بلانے پر بھی میرے ساتھ بات نہ کی۔ دو روز بعد ساس نے مجھے میرے گھر بھیج دیا۔ چند دنوں بعد میری ساس اور خاوند کی خالہ میرے گھر آئیں۔ میری ماں کو کمرے میں لے گئیں۔ معلوم نہیں کیا باتیں کرتی رہیں۔ بہت دیر بعد وہ دونوں کمرے سے نکلیں اور چلی گئیں۔ میں کمرے میں گئی تو ماں رو رہی تھی۔ میں سمجھ گئی۔ اس نے بَین کئے اور مجھے بُرا بھلا کہا۔ شام کو والدصاحب گھر آئے تو ماں نے انہیں بتایا۔ والدصاحب کمرے سے نکلے تو مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور ننگی گالیاں دیں۔ ان کے مُنہ سے میں نے ایسی ننگی گالی کبھی نہیں سُنی تھی۔

اور وہ میری ازدواجی زندگی کا پندرھواں روز تھا جب مجھے طلاق م گئی۔ ماں نے غصّے میں کہا کہ حق مہر اور ماہوار خرچ کا تقاضہ کریں گے۔ میں بول پڑی۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ طلاق کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میں حق مہ اور خرچ نہیں لوں گی۔ ان لوگوں نے یہ شرافت کی کہ میرے والدین کا دیا ہ تمام زیور اور کپڑے اور دیگر سامان واپس بھیج دیا۔ چار دیواری کی دنیا میں یہ معمولی نہیں تھا۔ ہم لوگ یعنی میرا سارا خاندان جو اپنے آپ کو امیر، ایڈوانس اور محلے برادری میں برتر سمجھتا تھا زمین پر آرہا۔ میں جو پاکستان میں ہی امری بن گئی تھی، قابلِ نفرت پاکستانی لڑکی بن گئی جسے خاوند نے پندرہویں ر بدکاری کے الزام میں طلاق دے دی تھی۔ محلّے کی عورتیں ہماری ہمدرد بن ہمارے گھر آنے لگیں۔ مجھے گھُور گھُور کر اوپر سے نیچے تک دیکھتیں۔ میں

سسرال کو بُرا بھلا کہتیں اور باہر جا کر مجھے اور میرے خاندان کو خوب ذلیل اور رُسوا کرتیں۔ میں سب کے لئے تماشہ بن گئی۔

والدصاحب نے میرے ساتھ بات کرنی چھوڑ دی۔ میرے ہاتھ کا پانی حرام قرار دے دیا۔ کبھی مجھے دیکھتے بھی تو قہر سے بھری ہوئی نظروں سے دیکھتے۔ وہی بھائی جنہوں نے بُرقعے کا مذاق اُڑایا، مجھے پردے میں بٹھانے کی مخالفت کی اور مجھے آزاد اور ماڈرن ہو جانے میں مدد دی تھی، میرے دُشمن ہو گئے۔ چھوٹے بھائی نے ایک روز مجھے پیٹا بھی۔ بڑا بھائی بات بات پر مجھے ڈانٹنے لگا۔ محلّے کی ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو میرے پاس آنے سے روک دیا۔ میں تن تنہا رہ گئی۔ راہِ راست پر آنے کی قسم چکنا چُور ہو گئی۔ ساری عمر خاوند کی غلام رہنے کے ارادے ٹوٹ پھُوٹ گئے۔ اگر وہ بدکار ڈاکٹر میری مدد کر دیتا تو آج پاکستان میں ایک طوائف کم ہوتی۔ میں ایک کمرے میں قید ہو گئی۔ کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے گھر کی دیواریں اور کواڑ بھی مجھ پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ میں اکیلی بیٹھ کر روتی تھی۔ دوسروں کا سامنا کیا کرتی، میں تو اپنا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔

میں نے سب کے گناہ اپنے ضمیر پر ڈال لئے۔

میں پناہ ڈھونڈنے لگی

چند دنوں بعد ماحول کی پھٹکار اور حقارت نے مجھ پر واضح کر دیا کہ اس گھر میں اور اس محلّے میں میرے لئے کوئی پناہ نہیں۔ آنے والے دن مجھے خوفزدہ کر رہے تھے۔ میری ذہنی حالت اُس قیدی کی سی تھی جسے پھانسی کے تختے کے سامنے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہو۔ میں نے ایک روز ارادہ کیا کہ مر کیوں نہ جاؤں۔ نجات کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا تھا۔ میں نے سوچ کر یہی بہتر سمجھا اور ایک شام گھر والوں کے سامنے باہر نکل گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ گھر والے مجھے روکیں گے۔ باہر نہیں جانے دیں گے لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے کسی نے نہ روکا۔ مجھے اس پر بھی غصہ آ گیا۔ دُکھ بھی ہوا کہ گھر والوں کی نظروں میں میری اتنی بھی اہمیت نہیں رہی کہ مجھ سے اتنا ہی پوچھ لیں کہ کہاں جا رہی ہو۔ میری حالت ایک مسافر کی سی ہو گئی تھی جو اس مسافر خانے میں آئی اور چلی گئی۔ کسی نے دھیان ہی نہ دیا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ شاید میرے والدین اور میرے بھائیوں کو کسی طرح پتہ چل گیا ہے کہ میں خودکشی کرنے جا رہی ہوں اس لئے انہوں نے مجھے روکا نہیں۔ خوش ہوں گے کہ چلو اس ناپاک وجود سے گھر پاک ہوا۔

میں خودکشی کرنے جا رہی تھی۔ میں ریل گاڑی کے آگے لیٹ جانے کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی اور میں سوچتی جا رہی تھی کہ گھر والوں نے مجھے باہر جانے سے روکا کیوں نہیں۔ میرا دماغ ماؤف تھا۔ کردار میں پختگی نام کو نہیں تھی جو مجھے ہوش ٹھکانے رکھ کر یکسوئی سے سوچنے دیتی۔ جو سوچ آتی اُلٹی آتی اور میں سوچوں کی آندھیوں میں تنکے کی طرح اُڑی جا رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن

میں دھماکہ ہوا اور ذہن خالی ہوگیا۔ میں نہیں بیان کر سکتی کہ وہ کیسی ذہنی کیفیت تھی۔ میں ریلوے لائن کی طرف جاتے جاتے وہیں پہنچ گئی جہاں سے میری یہ تباہی شروع ہوئی تھی۔ مجھے وہی دوست پناہ دے سکتے تھے جو میری طلاق کے ذمہ دار تھے۔ میرے ہونے والے بچے کا باپ انہی میں سے کوئی تھا۔ وہ میرے حسن کے شیدائی، میرے جسم کے پرستار اور میری مغربی اداؤں کے پروانے تھے۔

میں ہوٹل کے بال روم میں گئی تو وہ سب وہاں موجود تھے۔ یہاں سے میں صرف ایک مہینہ غیر حاضر رہی تھی۔ اتنے سے دنوں میں وہاں کئی لڑکیوں اور لڑکوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ پہلے سے زیادہ رونق تھی۔ میں نے بے اختیار چاہا کہ ان لڑکیوں کو چلا چلا کر کہوں کہ ابھی تمہارے چہروں پر معصومیت نظر آتی ہے۔ ابھی تم کنارے پر ہو۔ میرا حشر دیکھو اور میرا انجام دیکھو، دولت، فیشن اور مغرب کی دلفریب بھول بھلیوں میں گم ہوجانے سے پہلے یہاں سے بھاگ جاؤ۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں پہلی بار یہاں آئی تھی تو کتنی مردانہ سینوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر نچایا تھا۔ ساڑھے چار سال گزر گئے تھے۔ میں نے ساڑھے چار برسوں کی شامیں یہاں گزاری تھیں۔ ایک ہی روز پہلے کی بات معلوم ہوتی تھی جس نے میری ساری زندگی جہنم بنا دی۔

اس عرصے میں اخباروں میں لکھا جاتا رہا، مسجدوں میں واویلا بپا ہوتا رہا کہ پاکستان کی نئی پود مغرب کی تقلید میں تباہ ہو رہی ہے، مگر اس تباہی کو روکنے کی کسی نے کوشش نہ کی۔ میں آج بھی آپ کو وہ ایڈیٹر، وہ کالم نویس اور وہ رائٹر دکھا سکتی ہوں جو قوم کی تباہی کا لفظی رونا روتے ہیں اور شامیں انہی ہوٹلوں میں شراب پیتے اور ہیپی لڑکیوں سے دل بہلاتے گزارتے ہیں۔ میں آپ کو وہ سیاسی لیڈر دکھا سکتی ہوں جن میں سے کوئی پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتا ہے، کوئی جمہوری اور کوئی سوشلسٹ۔ یہ لیڈر مجھ جیسی لڑکیوں کے ہاتھوں شراب پیتے اور ان کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں۔ عوام کے غم میں گھلنے والوں کو میں نے ان یورپی ہوٹلوں میں وہ عیش کرتے دیکھا ہے جو مغلیہ

خاندان کے بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوتی ہوگی۔

میں دیکھ رہی تھی کہ انہی ایڈیٹروں، رائٹروں، لیڈروں اور بزرگوں کے دم قدم سے بال روم کی رونق بڑھ گئی تھی۔ ان ساڑھے چار برسوں میں پاکستان نے اس میدان میں بڑی تیزی سے ترقی کر لی تھی۔ پاکستان کے مغرب زدہ نوجوانوں میں غیر ملکی چہروں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ چرس کی جگہ امریکہ سے ایل ایس ڈی، ہیروئن اور ماریجوانا آگئی تھیں۔ پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں امریکی لب و لہجے میں انگریزی بولنے لگی تھیں۔ موسیقی بدل گئی تھی، ڈانس بدل گئے تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں شروع شروع میں جو ڈر سا، جھجک سی اور پکڑے جانے کی جو جھینپ سی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔

میں وہاں تماشائی بن کر نہیں گئی تھی۔ میں وہاں پناہ ڈھونڈنے گئی تھی۔ میرا وہ دوست وہیں تھا جس نے لیڈی ڈاکٹر کا پتہ دیا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا اور کترانے لگا۔ کچھ اور لڑکے بھی تھے۔ ان میں دو وہ بھی تھے جن کے ساتھ میں کار میں شہر سے باہر ویرانے میں جا چکی تھی۔ ایک وہ بھی تھا جس کے ساتھ میں نے باغ کے اندھیرے گوشے میں چار پانچ شامیں گزاری تھیں۔ ان سب کو شاید پتہ چل چکا تھا کہ میں اب لڑکی نہیں ماں ہوں۔ وہ سب مجھ سے نظریں چرا گئے لیکن کچھ نئے نوجوان بھی تھے جو مجھے نہیں جانتے تھے۔ ان کے لئے میں خوبصورت لڑکی اور نیا چہرہ تھی۔ میرے جسم میں ابھی کشش باقی تھی۔ تین چار لڑکے بیک وقت میرے پاس آئے۔ میں ان کے منہ پر تھوک دینا چاہتی تھی مگر ان کے منہ پہ تھوک کر جاتی کہاں؟ میں تو یہاں پناہ کی تلاش میں آئی تھی۔

بال روم (جسے آپ چور کمرہ کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا) میں جا کر جہاں مجھے اپنے دوستوں کی بے وفائی کا رنج ہوا، وہاں یہ فائدہ بھی ہوا کہ میرا دماغ سوچنے کے قابل ہوگیا۔ گھر کی زہریلی گھٹن میں اور گھر والوں کے پُرنفرت رویے سے تو میرا دماغ ماؤف ہوگیا تھا۔ ہوٹل کے تہہ خانے میں پہنچی جہاں مغربی موسیقی کا ہنگامہ، ناچ کی دھما چوکڑی اور ہر قسم کی منشیات کی بُو تھی۔ میرا دماغ ٹھکانے آگیا۔ ایک نوجوان نے مجھ سے پوچھا: "آپ کیا پئیں گی؟"

میں نے جذباتی سا ہو کے جواب دیا۔" کوئی بہت ہی سٹرانگ چیز۔"

یہ مکالمے ہم نے امریکی لب و لہجے میں انگریزی میں بولے تھے۔ وہ سمجھ گیا اور مخصوص سگریٹ لے آیا۔ تین چار کش لگانے تو میرے سارے دُکھ دُور ہو گئے۔ ذہن صاف ہو گیا، اور میں نے نجات کی راہ سوچ لی۔ خودکشی کو ایک بھونڈا مذاق سمجھ کر ذہن سے نکال دیا۔ مجھے سسرال نے قبول نہیں کیا تھا۔ میکے نے قبول نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قبول کر لیا اور فوراً سوچ لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

میں نے ان نئے نوجوانوں کا جائزہ لیا جو مجھے اپنی اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ ان میں ایک ایسا تھا جو میرے مطلب کا تھا۔ وہ مجھ میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ نشے کا کش لگا کر میری شگفتگی اور مغربی اداکاری عود کر آئی تھی۔ اس سے میری خوبصورتی کی کشش بھی عود کر آئی۔ یہ نوجوان جو دراصل نوجوانی کی حد سے اوپر چلا گیا تھا چالاک اور ہوشیار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی جاگیردار کا بیٹا ہے۔ یہاں کالج میں پڑھتا ہے۔ دیہاتی ہے اور دولت کے زور پہ امریکن بن گیا ہے۔ میں ایسے ہی کسی نوجوان کو پھانسنا چاہتی تھی۔ اس کے متعلق یہ بھی معلوم ہُوا کہ ایک کوٹھی میں رہتا ہے۔ اپنے ساتھ تین لڑکے رکھے ہوئے تھے۔ کھانا پکانے کے لیے خانساماں ہے۔

میں نے جواب میں اس میں دلچسپی کا اظہار کیا اور اسے باہر لے گئی۔ ہم ایک باغ میں جا بیٹھے۔ میں نے محبت کا اظہار کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور فلمی ہیرو بن گیا۔ اس پہلی ملاقات میں ہم نے شادی بھی طے کر لی اور کہا کہ کل اسے کوٹھی میں ملوں گی۔ میں نے اسے وقت اور مقام بتا دیا۔ میں گھر چلی گئی۔ گھر میں مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ میں کہاں گئی تھی۔ کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ میرا کمرہ الگ تھا۔ میں جا کے لیٹ گئی اور بہت دیر اپنے مستقبل کے متعلق سوچتی رہی۔ معلوم نہیں کس وقت آنکھ لگی۔

دوسرے دن میں اُس جگہ پہنچی جہاں اسے ملنے کو کہا تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے وہاں کھڑا تھا۔ مجھے اپنی کوٹھی میں لے لیا۔ میں نے اس کی کوٹھی میں

اس کے ساتھ تین ملاقاتیں کیں۔ اس دوران اس کے متعلق میں نے سب کچھ معلوم کر لیا۔ اس کا باپ بہت ہی امیر جاگیردار تھا اور وہ خود سر اور لاڈلا بیٹا تھا۔ میں نے چوتھی ملاقات میں اسے کہا۔" تم میرے ساتھ شادی کرنے کو بے تاب ہو لیکن میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میرے پیٹ میں گناہوں کا پھل پک رہا ہے۔ دوسرا مہینہ پورا ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر شادی کے پندرہویں روز مجھے طلاق مل گئی ہے۔ کیا تم مجھے اس حالت میں قبول کر لو گے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے فرش پر بیٹھ کر اس کے پاؤں پکڑ لئے اور رو کر کہا۔"خدا کے لئے مجھے اسی حالت میں قبول کر لو۔ مجھے اُن دوستوں نے بھی ٹھکرا دیا ہے جنہوں نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔ گھر والوں نے مجھے اچھوت قرار دے دیا ہے۔" روتے ہوئے میں نے ڈاکٹر کی بدکاری کے متعلق، خاوند کے متعلق اور سب کے متعلق بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر اس نے بھی مجھے ٹھکرا دیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ میں نے اسے کہا۔" کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہاری محبت فریب تھا اور تم جسمانی عیاشی کے لئے مجھے اپنے ساتھ لئے پھرتے تھے؟"

"میں ماں بہن کی گالی برداشت کر لوں گا۔" اس نے کہا۔" بے وفائی کا طعنہ برداشت نہیں کروں گا۔ ہم لوگ اس طعنے پر سر کھول دیتے ہیں۔ پھانسی چڑھ جاتے ہیں۔"

وہ دراصل دیہاتی علاقے کا آدمی تھا۔ شہری تہذیب کا تو اس نے اپنے اُوپر بہروپ چڑھا رکھا تھا۔ وہ دیہاتی کلچر کی مخصوص غیرت میں آ گیا مگر اس نے کہا۔" جس طرح تم نے مجھے دھوکے میں نہیں رکھا اسی طرح میں بھی تمہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گا کیونکہ میں اس حالت میں تمہیں اپنی برادری میں نہیں لے جا سکتا لیکن تمہیں اپنی کوٹھی میں رکھوں گا اور آخر دم تک تمہاری حفاظت کروں گا۔ کیا تم گھر سے بھاگنا چاہتی ہو؟ اگر ایسا ارادہ ہے تو میرے پاس آ جاؤ۔"

مجھے یہ صدمہ ضرور ہوا کہ میں نے جس طرح اسے پھانسنے کی کوشش کی تھی، اس طرح کامیاب نہ ہو سکی لیکن مجھے اطمینان یہ ہُوا کہ اس نے مجھے دھوکے میں نہیں رکھا اور یہ نہیں کہا کہ گھر سے بھاگ آؤ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا۔ مجھے فیصلہ کرنے میں کوئی دیر نہ لگی۔ میں تو اب ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔ میں نے اسے کہا کہ کل ہی آجاؤں گی۔

عیسائیوں کے جال میں

میری زندگی کا وہ دن طلوع ہُوا جب میں گھر سے نکلی اور آج تک واپس نہیں گئی۔ لڑکیاں گھروں سے ڈولی میں نکلا کرتی ہیں، میں چوروں کی طرح نکلی، گھر سے کچھ رقم چُرا کر اور اپنے زیورات اُٹھا کر پرس میں ٹھونس لئے تھے۔ اس پرس اور پہنے ہوئے کپڑوں کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے گھر سے دُور جا کر بھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ یہ گھر رشوت کے زور پر امیر اور ماڈرن بنا تھا۔ رشوت نے مجھے ڈس لیا اور میں جسے ایک گھر آباد کرنا تھا اور پاکستان کے وارثوں کو جنم دینا تھا، اُس منزل کی طرف چل پڑی جہاں مجھ جیسی ہزاروں بیسوائیں گھر اجاڑا کرتی ہیں اور پاکستان کے وارثوں کو پاکستان کے نام سے ہی نا آشنا کر دیتی ہیں۔

میں اُس کی کوٹھی میں چلی گئی۔ وہ کالج گیا ہُوا تھا۔ خانساماں نے میری بہت خاطر تواضع کی۔ دو گھنٹے بعد وہ آگیا۔ اس کے ساتھ تین لڑکے تھے۔ وہ جابر اور حاکم قسم کا آدمی تھا۔ میں نے اسے الگ لے جا کر پرس کی ساری رقم اور زیورات اس کے آگے رکھ دیئے اور کہا کہ یہ رکھ لو۔ اس نے بڑے اطمینان سے رقم اور زیورات پرس میں ڈالے اور پرس مجھے دے کر کہا۔ "مجھے بے غیرت نہ سمجھو۔" اس نے مجھے میرا کمرہ دکھا دیا اور پوچھا۔ "اپنی ضرورتیں بتاؤ۔"

اگر میں آپ کو تفصیل سے بتانے لگوں کہ ان چار لڑکوں نے مجھے آٹھ نو مہینے اپنے پاس کس طرح رکھا تو آپ یقین نہیں کریں گے کیونکہ آپ بھی اُنہی ایڈیٹروں میں سے ہیں جو کہا کرتے ہیں کہ ہمارا نوجوان طبقہ گمراہ ہو گیا ہے۔ میں آپ کو صرف اتنا بتاتی ہوں کہ آپ کے اپنے نوجوان طبقے کو گمراہ کر دیا ہے۔ آپ اگر میری ان باتوں پر یقین کر لیں گے جو میں آپ کو ان چار نوجوانوں کے

متعلق بتاؤں گی تو آپ صرف اس پر ہی ایک کتاب لکھ سکیں گے لیکن میں بات مختصر کردوں گی۔ وہ یہ ہے کہ وہ آوارہ امیرزادے تھے لیکن میرے سامنے انہوں نے آوارگی کا کبھی اشارہ بھی نہ کیا۔

صرف ایک واقعہ بتا دیتی ہوں۔ اس کوٹھی میں میری دوسری رات تھی۔ میرے اس دوست کا کمرہ الگ تھا، میرا الگ۔ باقی تین ایک ہی کمرے میں رہتے اور سوتے تھے۔ آدھی رات کو میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے فوراً اس شہزادے کا خیال آیا جس نے اتنی دلیری سے مجھے پناہ دی تھی۔ اس کے انداز سے مجھے اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ آخر دم تک میرا ساتھ دے گا مگر اس نے اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ پہلے وہ مجھے پاگلوں کی طرح چاہتا بلکہ چاٹتا تھا مگر اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ میں اس کی احسان مند تھی۔ زیورات اور رقم لینے سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ میں اسے کچھ نہ کچھ عوضانہ ضرور دینا چاہتی تھی۔ میرے پاس اپنے خوبصورت جسم کے سوا اور تھا ہی کیا۔ یہ ایسی متاع تھی جو میں پہلے ہی لٹا چکی تھی۔ شرم اور حجاب کا تو میری ذات میں وجود ہی نہیں تھا۔ میں اس کوٹھی میں اپنی کوئی حیثیت بنانا چاہتی تھی اور وہ حیثیت داشتہ کی ہی ہو سکتی تھی۔

میں کمرے سے نکلی اور اس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کی رضائی ہٹائی اور اس کے پاس لیٹ گئی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ پھیرا اور بدک کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے کہا: "فوراً اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔"

میں نے اس کے گلے میں بازو ڈال کر پوچھا: "یہ بے رخی کیوں؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں شریف آدمی نہیں ہوں۔" اس نے کہا: "لیکن تمہارا جسم مجھ پر حرام ہے۔ میں نے تمہیں پناہ دی ہے۔ تمہیں اپنی عیاشی کے لئے اپنے پاس نہیں رکھا۔ تم نے مجھے طعنہ دیا تھا کہ تم جسمانی عیاشی کے لئے مجھے اپنے ساتھ لئے لئے پھرتے تھے۔" اور اس نے کہا: "میں تم پر ثابت کروں گا کہ میں کمینہ انسان نہیں ہوں۔ تم جانتی ہو کہ وہ کون سا نشہ ہے جو ہم چاروں نہیں کرتے، اور کون سی بدکاری ہے جو ہم نہیں کرتے لیکن ہم چاروں کے لئے تم عورت نہیں ہو۔ تم فوراً میرے کمرے سے نکل جاؤ۔"

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ مجھے اپنے بستر سے نہ اٹھاتے لیکن مجھے اٹھنا پڑا اور میں اس کے کمرے سے نکل آئی۔ پھر میں نے ان چاروں کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک صبح ان کی رضائیاں تہہ کرنے لگی مگر انہوں نے منع کر دیا۔ ان کے کمروں کی جھاڑ پونچھ کرنے لگی تو بھی انہوں نے روک دیا۔ میں نے اصرار کیا کہ میں یہ کام ضرور کروں گی تو جاگیردار کے بیٹے نے مجھے ڈانٹ دیا۔ آپ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ واقعی شریف لڑکے نہیں تھے۔ والدین کی اندھی دولت ہوٹلوں میں مجھ جیسی ماڈرن لڑکیوں کو کھلاتے اور شراب میں بہاتے تھے۔ کالج تو عیاشی کا ایک بہانہ تھا لیکن میرے لئے وہ شریف اور بھلے مانس تھے۔ میں ان کی خدمت کرنا چاہتی تھی لیکن وہ میری دیکھ بھال کرتے اور میری ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ وہ میرے ساتھ بے تکلفی سے گپ شپ لگاتے۔ میں ان کے ساتھ تاش بھی کھیلتی لیکن انہوں نے کبھی ہلکی سی بدتمیزی بھی نہیں کی۔ کبھی بیہودہ مذاق نہیں کیا۔

یہی وہ نوجوان ہیں جن کے متعلق آپ کہا کرتے ہیں کہ گمراہ ہو گئے ہیں۔ یہ چاروں گمراہ تھے۔ یقیناً بھٹکے ہوئے تھے لیکن میرے پاس آ کر ان کی راہیں سیدھی ہو جاتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے اندر کردار زندہ تھا۔ یہ آپ کا کام ہے اور یہ معاشرے کے بزرگوں کا کام ہے کہ نوجوانوں کے کردار کا تحفظ کریں۔ انہیں کوئی مقصد دیں۔ انہیں کوئی منزل دکھائیں۔ اگر آپ فلسفہ اور نفسیات پڑھے ہوتے ہیں تو خود ہی تجزیہ کر لیں کہ ان چار نوجوانوں کا کردار دو متضاد اقسام کا کیوں تھا۔ میں آپ کو واقعات سنا رہی ہوں یا یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کو آئینہ دکھا رہی ہوں۔ اس میں اپنی سوسائٹی کا چہرہ دیکھ لیجئے۔

میں ان لڑکوں کے پاس آئی تو انہوں نے مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے اس مقصد کے لئے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں بھیجیں گے کیونکہ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں خود بھی

کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ پہلے ڈاکٹر کی طرح دوسرا ڈاکٹر بھی میری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ میں کوئی نیک پاک لڑکی تو نہیں تھی لیکن میرے ذہن میں ڈاکٹر کا تصور بڑا پاک اور معزز تھا۔ وہ بُت ٹوٹ گیا تھا۔ مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ جاگیر دار کا بیٹا منجھا ہُوا آدمی تھا۔ میری طرح جو لڑکیاں اپنی تہذیب سے بھاگ کر مغرب کے ننگے کلچر میں جا گم ہوتی تھیں، ان میں سے بیشتر میری طرح کی مصیبت میں گرفتار ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ چوری چھپے اپارشن کرا لیتی تھیں یا عیسائیوں کے کسی ہسپتال میں بچہ جن کر انہی کے حوالے کر آتی تھیں۔ میرے اس محسن نے مجھے ایسے ہی ایک ہسپتال کا راستہ دکھایا اور مجھے چھپائے رکھنے کے لئے برقعہ سلوا دیا۔

میں اس ہسپتال گئی۔ ایک عیسائی لیڈی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ غیر شادی شدہ ہوں اور ماں بننے والی ہوں۔ اس کا چہرہ مسرت سے کِھل اُٹھا اور اس نے ایسی پیاری باتیں کیں جن سے میرے ضمیر سے گناہ کا بوجھ اُتر گیا اور میں گناہ کا جو بوجھ کو کھ میں اُٹھائے پھرتی تھی۔ اس کی اذیت میں نمایاں کمی ہو گئی۔ ایسا خلوص اور ایسا درد تو میری سگی ماں کے دل میں نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”نادانی میں تم سے ایک گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ اپنے آپ کو اندر ہی اندر کھائی جلاتی نہ رہو۔ یہاں ہم تمہیں اس گناہ کی سزا سے صاف بچا لیں گے۔“

”بچے کو کہاں لے جاؤں گی؟“

”لے جاؤ گی کہاں؟“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”وہ یہیں رہے گا اور تم یہاں سے اس طرح خوش و خرم اور صحت یاب ہو کے نکلو گی کہ کنواریوں سے زیادہ صحت مند نظر آؤ گی۔“

اس کے اتنے پیارے سلوک نے مجھے اس کا گرویدہ بنا لیا۔ میرے رُکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔ اس کی تسلی اور تشفی نے مجھ سے ساری باتیں اگلوا لیں۔ اسے جب یہ پتہ چلا کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی ہوں، اور عارضی طور

پر غیر شادی شدہ مردوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ تو اس نے کہا۔ ”بچے کی پیدائش کے بعد تمہارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہو گا کہ کہاں جاؤ گی؟ کہاں رہو گی؟ اور زندہ رہنے کے لئے کیا کرو گی؟“ ان سوالوں نے مجھے لرزا دیا۔ میں نے آگے کی تو سوچی ہی نہیں تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا:

”گھبراؤ نہیں۔ ہمارے پاس اس کا بھی علاج ہے۔ ہم تمہیں باعزت طریقے سے اپنے پاس رکھیں گے۔ باعزت ذریعہ معاش دیں گے اور کسی صاحب حیثیت سے تمہاری شادی کرائیں گے۔“

میں بدستور خاموش تھی۔ اس نے میرے چہرے کا جائزہ لے کر کہا۔

”تم اپنے آپ میں صرف اتنی تبدیلی پیدا کر لینا کہ عیسائی مذہب اختیار کر لینا۔“

میں اس طرح چونکی جیسے کسی نے بے خبری میں مجھے سوئی چبھو دی ہو۔ میرا کوئی مذہب نہیں رہا تھا۔ میں اپنے مذہب اور اپنے کلچر کی مفرور تھی۔ میں برائے نام مسلمان تھی لیکن اس غیر مذہب کی لیڈی ڈاکٹر نے جب مجھے مذہب تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تو مجھے یوں صدمہ ہُوا جیسے عصمت کے بعد سب سے زیادہ قیمتی چیز مذہب تھی۔ یہی ایک متاع میرے پاس رہ گئی تھی۔ کیا یہ بھی لٹا دوں؟ ”نہیں“ میرے دل سے آواز اُٹھی۔ ”میں مذہب نہیں چھوڑوں گی۔“ مگر میری مجبوری دیکھئے میں انکار نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ میری نجات اسی چھت تلے تھی جہاں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے لئے جھوٹ بولنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ بچے کی پیدائش کے بعد عیسائی ہو جاؤں گی۔

اس نے میرا معائنہ کیا اور ہر پندرھویں روز معائنے کے لئے آنے کو کہا۔ میں وہاں سے مطمئن ہو کر نکلی۔ بوجھ ہلکا ہو گیا تھا مگر اس سوال نے مجھ پر وہی بوجھ ڈال دیا کہ اس کے بعد کہاں جاؤں گی؟ یہی چار لڑکے تھے جن میں سے کسی کے ساتھ شادی کر سکتی تھی مگر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ یہی کچھ سوچتی میں لڑکوں کی کوٹھی میں پہنچی۔ لڑکوں کو بتایا کہ لیڈی ڈاکٹر نے کیا کہا اور میں

نے کیا سوچا ہے۔ انہوں نے مجھے تسلی دے کر کہا کہ وہ وقت آجائے تو دیکھا جائے گا۔

وقت گزرتا گیا۔ اذیت کی گھڑیاں بڑی لمبی تھیں۔ میں پندرھویں روز لیڈی ڈاکٹر کے پاس جاتی تھی۔ ہر بار وہ میرا استقبال ایسے والہانہ انداز سے کرتی تھی جیسے ماں سسرال سے آتی ہوتی بیٹی کا کرتی ہے۔ ان چار لڑکوں نے مجھے ایک قیمتی راز کی طرح چھپائے رکھا۔ میں سیاہ برقعے میں ایک سیاہ کالا راز بنی رہی اور وہ دن آگیا جو قیامت سے کم نہیں تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے مجھے دو روز پہلے ہی ہسپتال میں داخل کر لیا تھا اور مجھے پرائیویٹ کمرے میں رکھا۔ رات کے وقت میں نے ایک بچے کو جنم دیا۔ سہاگنوں کے ہاں بچے ہوتے ہیں تو خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ دعوتیں اڑتی ہیں مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں، مگر میری کوکھ سے بچہ پیدا ہوا تو میں نے منہ پھیر لیا۔ اس کی صورت بھی نہ دیکھی۔ یہ ناپاک لوتھڑا گناہ کی پیداوار تھا۔ ذرا جتنا پھول جیسا بچہ میرے ضمیر پر منوں وزنی سل بن کر پڑا تھا۔ میں اپنے گناہوں کو چومنے سے، دیکھنے سے گھبرا رہی تھی۔ میں بہت روتی اور نرس سے کہا۔ ”بچہ لے جاؤ، میں نہیں دیکھوں گی۔“

مسلمان باپ اور مسلمان ماں کے بچے کو صلیبی اٹھا لے گئے۔ یہ بچہ مبلغ بنے گا۔ عیسائیت کا پرچار کرے گا اور یہ گناہ بھی میری گردن پر ہوگا۔ اس گناہ تک مجھے ایک مشنری سکول کی آزاد فضا نے پہنچایا تھا، اور ایک مشنری ہسپتال کے بند کمرے میں میرے گناہ کی پیداوار مجھ سے وصول کر لی گئی۔ اُس وقت جب میرے بچے کو اٹھا کر ایک نرس کمرے سے نکل رہی تھی تو بچہ رو دیا۔ میں زمین اور آسمان کی موسیقی اس نوزائیدہ بچے کے رونے پر قربان کر دوں۔ جی میں آتی کہ اٹھوں، نرس سے بچہ چھین لوں اور اسے سینے سے لگا کر چومتی ہی رہوں۔ وہ میرے جگر کا ٹکڑا تھا جو نوچ لیا گیا۔ میں نے اس ماں کا گلا گھونٹ کر بے دردی سے مار دیا جو میری ذات میں بیدار ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ یہ بچہ میرا نہیں۔ یہ میرے

خاوند کا بچہ نہیں۔ یہ میرے گناہ تھے جو میرے وجود سے الگ ہو گئے ہیں۔ جی ہاں، یہ میرے ہی گناہ تھے۔ میں نے سب کے گناہ اپنی گردن پر لے لئے ہیں۔ اپنے حساب میں لکھ لئے ہیں۔ اُن ماں باپ کے گناہ کو بھی اپنے ضمیر پر رکھ لیا ہے جنہوں نے مجھے کانونیٹ سکول میں داخل کرایا تھا۔ میں نے قوم کے گناہ کو بھی اپنے سینے میں رکھ لیا ہے جس نے اپنے غلیظ سکولوں کو اس قابل نہ بنایا کہ لوگ اپنے بچوں کو غیر مذہب کے سکولوں میں داخل نہ کرائیں اور ان کے کچے کچے، ننھے ننھے ذہنوں کو مغرب کے عریاں تہذیب و تمدن سے محفوظ رکھیں۔ اُس وقت میرا ابھی ذہن کچا تھا۔ مجھے جو چیز اچھی لگی اسے سینے میں سمو لیا۔ ماں باپ اور بھائیوں نے اس چیز کی تعریفیں کیں اور گھر میں مذہب اور شرافت کا نام و نشان نہ رہنے دیا۔ رشوت کے زور پر امیر اور ماڈرن بن گئے۔ میں نے بوس و کنار اور جنسی لذت سے بھرپور فلمیں پاس کرنے والوں کے گناہوں کا بھی بوجھ اٹھا لیا ہے۔ جنسی اختلاط کی تصویریں چھاپنے والوں فحش رسالے نکالنے والوں اور ننگے ناول لکھنے اور بیچنے والوں کے گناہ بھی اپنے حساب میں لکھ لئے ہیں۔ ان سب کے گناہ جب میری کوکھ میں اتر گئے تو سب نے میرے نام پر تھوک کر مجھے جلاوطن کر دیا۔

علمائے کرام کے فتوے کے مطابق سزا مجھے ہی ملنی چاہیئے۔ سنگسار مجھے ہی ہونا چاہیئے لیکن یہ نہ بھولیے کہ میں تھرڈ ایئر تک پڑھی ہوں۔ انگریزی سکول میں ابتدائی تعلیم پائی ہے۔ میں کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائف نہیں۔ غیر ملکی اور پاکستانی دانشوروں کے ساتھ، سیاستدانوں اور عالموں کے ساتھ بھی اٹھی بیٹھی ہوں۔ اُن کے ساتھ راتیں گزاری ہیں۔ میں بہت کچھ سمجھتی ہوں۔ بہت کچھ جانتی ہوں۔ میں نے ان سب کے جو میرے پاس آتے ہیں ننگے جسم نہیں ننگے ضمیر دیکھے ہیں۔ آپ نے منہ کھلوایا ہے تو اب مجھے بات ذرا کھل کر کرنے دیجئے۔

میں ہسپتال کی بات کر رہی تھی۔ میں نے اپنے بچے کی صورت نہیں دیکھی۔ مجھے عیسائی بنانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تڑکے کے ایک پادری

ہاتھ میں موم بتی اُٹھاتے ہُوئے آتا۔ کچھ پڑھتا اور جلتی موم بتی میرے جسم کے اوپر اوپر گھما کر چلا جاتا۔ ہر صبح میری آنکھ اس پادری کے گنگنانے سے کھلتی۔ دنیا کی پہلی آواز یہی ہوتی جو میرے کانوں میں پڑتی۔ عموماً ہسپتال سے ساتویں آٹھویں روز فارغ کر دیا جاتا تھا۔ میں ایک ہفتے بعد فارغ ہونے کے قابل ہو گئی لیکن مجھے چھٹی نہیں دی جا رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آتی، ایک نن آتی، نرسیں آتیں اور میری برین واشنگ کر کے چلی جاتیں۔ یہ روز مرّہ کا معمول تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معمول بڑا ہی پیارا تھا۔ ان کی باتوں میں ہمدردی اور اُنس تھا۔ انہوں نے میرے سارے خدشے دُور کر دیتے تھے۔ سارے مسئلے حل کر دیئے تھے۔ میری شادی تک کا بندوبست کر لیا تھا، اور میں اس حسین جال میں پوری طرح پھنس گئی تھی۔

ہسپتال میں شاید بیسویں رات تھی۔ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ خواب میں جلتے ہوئے مکان دیکھے۔ یہ میرا گاؤں تھا جو جل رہا تھا۔ میں نے اپنا وہ چھوٹا سا سکول بھی جلتا دیکھا جہاں میں نے قرآن کا پہلا پارہ پڑھا تھا۔ میں اکیلی اندھیرے میں بھاگی جا رہی تھی۔ میں چھ سات سال کی بچی تھی۔ دو سکھ میرے پیچھے دوڑے آ رہے تھے۔ میں گر پڑی اور میری آنکھ کھل گئی۔ ایسی گھبراہٹ کہ دل کی دھڑکن کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ خوف سے میں سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ میں کلمہ پڑھنے لگی اور ہاتھ لمبا کر کے بتی جلا دی۔ تب مجھے یقین ہوا کہ میں ہندوستان کے کسی کھیت میں نہیں، ہسپتال کے کمرے میں بستر پر پڑی ہوں۔

میں کلمہ پڑھ رہی تھی۔ مجھے اس گھبراہٹ اور خوف میں یاد آ گیا کہ دو تین روز بعد یہ لوگ مجھے عیسائی بنا لیں گے اور میں ان کی قیدی بن جاؤں گی کمرے میں میرا برقعہ لٹک رہا تھا۔ سرہانے کے نیچے میرا پرس پڑا تھا۔ میں نے پرس اٹھایا، برقعہ اوپر لیا اور کمرے سے نکل گئی۔ ہسپتال خاموش تھا۔ مجھے معلوم نہیں وقت کیا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی بڑے گیٹ سے نکل گئی۔ چوکیدار مجھے دیکھتا رہا۔ سڑک ویران تھی۔ کچھ دُور جا کر ایک تانگہ مل گیا۔ اس نے جتنے پیسے کہے، میں نے ہاں کہہ دی اور تانگے میں بیٹھ گئی۔ میں اپنے چچا

محسنوں کے ہاں پہنچی۔ وہ ابھی ابھی باہر سے آتے تھے۔ وہاں پتہ چلا کہ رات کا ایک بج چکا ہے۔ وہ حیران ہوئے کہ آدھی رات کے وقت کیوں آئی ہوں۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔ وہ بھی میری طرح نام کے مسلمان تھے لیکن میرے اس کارنامے پر وہ عش عش کر اُٹھے۔

میرے حسن نے اسے ننگا کر دیا

اب سوال یہ تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں رہوں۔ ان نوجوانوں کے پاس میں اب زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔ رہنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ ان میں سے کوئی بھی میرے ساتھ شادی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں اب کسی کے قابل نہیں رہی تھی۔ ان کا یہ احسان کیا کم تھا کہ انہوں نے مجھے اتنا عرصہ صرف پناہ ہی نہیں دی بلکہ چھپائے بھی رکھا۔ میں انہیں اور زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی میں گھبرا جاتی تھی اور دل میں یہ ارادہ آجاتا تھا کہ اپنے گھر چلی جاؤں مگر کچھ وسوسے اور خدشے تھے جو گھر نہیں جانے دیتے تھے۔ میں نے جاگیردار کے بیٹے سے کہا کہ کہیں اچھی سی نوکری مل جائے تو رہائش کا بندوبست کر لوں گی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ نوکری تلاش کر دے گا۔ البتہ رہائش کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا تھا۔

یہ تو مجھے توقع تھی کہ میں جہاں بھی چلی گئی، مجھے نوکری ضرور مل جائے گی۔ میری تعلیم اچھی تھی اور انگریزی سکول میں پڑھنے کی وجہ سے میں انگریزی بڑی روانی سے بول سکتی تھی، لیکن میرے اصل اوصاف میری شکل وصورت، قدبُت اور جوانی تھی۔ کوئی پتھر دل والا مرد ہی مجھے مایوس کر سکتا تھا مگر مجھے مستقل رہائش کے مسئلے نے پریشان کر دیا۔ ہمارے ملک میں عورت مویشیوں کی طرح کام کر سکتی ہے، لیکن تنہا نہیں رہ سکتی۔ اسے ایک مرد کے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ شریفانہ زندگی بسر کروں گی اور کسی شریف آدمی کے ساتھ فوراً شادی کرنے کی کوشش کروں گی۔

میرے دوست نے چار پانچ روز بعد مجھے ایک پرائیویٹ فرم کا پتہ

دیا اور کہا کہ اس کے مینجنگ ڈائریکٹر کو پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ شریف آدمی ہے۔ میں دوسرے دن اس کے دفتر میں گئی۔ وہ شکل وصورت سے ہی شریف اور نیک لگتا تھا۔ عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان ہوگی۔ میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ پہلے چونکا۔ پھر مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بدک کر نارمل حالت میں آگیا۔ مجھے بیٹھنے کو کہا اور ہکلا کر بولا۔ "جی ہاں، مجھے ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے۔ لیکن..... لیکن..... مشکل یہ ہے کہ....."

"میرے ساتھ آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔" میں نے اس کی مشکل سمجھے بغیر کہا۔ "میں بی اے تو نہیں کر سکی۔ تعلیم بی اے سے زیادہ ہی اچھی ہوگی۔ میرا کام دیکھ لیں۔ آپ کی مشکل کیا ہے؟"

"آپ برا تو نہیں مانیں گی؟" اس نے ایسے لہجے میں کہا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ چالاک نہیں ہے اور عورتوں کے معاملے میں اناڑی ہے۔

"آپ کے دل میں جو کچھ بھی آتا ہے کہہ ڈالیں میں برا نہیں مناؤں گی۔ میں مجبور لڑکی ہوں۔ اپنے سہارے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"میرے دل میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے دراصل اتنی خوبصورت اور اتنی جوان لڑکی کی ضرورت نہیں تھی۔" وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ "بہرحال آپ کو میں رکھ لیتا ہوں ..... بر تو آزما دیں۔ اگر آپ قبول کر لیں تو میں آپ کو تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ دوں گا۔"

میں نے یہ تنخواہ قبول کر لی۔ اس نے میرا ایڈریس پوچھا تو میں نے اس کوٹھی کا نمبر دے دیا جہاں ان چار نوجوانوں نے مجھے پناہ دے رکھی تھی۔ اس نے مجھ سے ذاتی باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ اس کا خلوص تھا۔ میری مجبوری سنے بغیر اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ مجھ جیسی لڑکی نوکری کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ اس کی باتوں میں مجھے مشفق باپ کی بڑی صاف جھلک نظر آئی۔ میں نے دل میں اسے باپ کا درجہ دے دیا اور سوچا کہ کچھ روز بعد اسے کہوں گی کہ میری رہائش کا بھی کوئی انتظام کر دے اور اگر اس

کے بچے پڑھتے ہیں تو میں انہیں پڑھا دیا کروں گی۔ وہ میرے ساتھ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔

ذرا میری حالت پر غور کیجئے۔ میں گھر سے بھاگی ہوئی تھی۔ کوئی سہارا اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اسی شہر میں رہتے یہ خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا تھا کہ اپنے والد صاحب یا بھائیوں کو نظر آجاؤں گی یا کوئی جاننے والا مجھے دیکھ لے گا اس لئے میں نے اپنے آپ کو برقعے میں لپیٹ لیا تھا۔ میری سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں نے شریفانہ زندگی بسر کرنے کی قسم کھالی تھی۔ اس قسم کے پیش نظر میرے والدین کا گھر بھی شریفوں کا گھر نہیں تھا۔ ورنہ میرے لئے نہایت آسان راستہ یہ تھا کہ کسی دولت مند عیاش کی داشتہ بن جاتی۔ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی تو نہیں مگر میں نے اپنے آپ کو زنجیروں میں باندھ لیا تھا۔ ان حالات میں میری اندرونی کیفیت ایسی تھی جیسے میرے اندر گہرا زخم ہو گیا ہو یا دل میں کوئی ناسور ہو جو نہ پکتا ہو نہ پھٹتا ہو۔ اس کیفیت میں ہمدردی کا ایک لفظ بھی میرے دل کے ناسور کو تسکین دے دیتا تھا۔ اس معمر مینجنگ ڈائریکٹر کی باتوں میں اور اس کے انداز میں ایسا ہی اثر تھا جس سے میری روح بھی سرشار ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ میرا کام سمجھا دیں تو اس نے کہا:

"ساری عمر کام ہی کرنا ہے نا۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہارے اندر گھبراہٹ گھٹن اور خوف ہے۔ جب تک تم میرے پاس ہو، میں چاہتا ہوں کہ خوش باش رہو۔" اور اس قسم کی بے شمار ہی باتیں تھیں جو اس نے ایسے مخلصانہ لب و لہجے میں کہیں کہ میرے آنسو نکل آتے اور میں نے بے قابو ہو کر کہہ دیا۔ "میں بے ٹھکانہ اور دھتکاری ہوئی لڑکی ہوں۔ مجھے اپنے سر پر آپ جیسے کسی بزرگ کے دست شفقت کی اور ایک چھت کی ضرورت ہے جو میرے گناہگار وجود کو دنیا کی نظروں سے چھپا لے۔ محترم! میں ایک بڑا گندہ راز ہوں۔ آپ اسے اپنے سینے میں اور اپنی چھت تلے محفوظ رکھنا گوارا نہیں کریں گے؟"

یہ میری ایک دکھتی رگ تھی جو میں نے اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اس

نے کہا۔ "تمہیں کچھ دنوں بعد پتہ چلے گا کہ میں کیا ہوں۔ میں تمہیں تمہارے راز سمیت اپنے سینے میں چھپالوں گا۔ بات ذرا کھل کر کرو میرے دستِ شفقت کو اپنے سر پر سمجھو۔"

اس کی بزرگی میرے اعصاب پر غالب آچکی تھی۔ میں نے یہ تو نہ بتایا کہ میں ایک بچہ عیسائیوں کے ہاں جن کر بھاگ آئی ہوں، باقی سب کچھ اسے بتا دیا۔ نئی تہذیب نے جس طرح مجھے ڈنک مارا تھا وہ تفصیل سے بتایا اور صاف الفاظ میں کہا۔ "میں آپ کو صحیح طور پر نہیں بتا سکتی کہ میں اپنا جسم کتنے آدمیوں کو کتنی بار دے چکی ہوں۔" میں نے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میں تمہیں پاک سمجھتا ہوں۔ تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ میں جہاندیدہ آدمی ہوں۔ اچھے بُرے لوگ دیکھے ہیں۔ اپنے تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ خوبصورتی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ تمہاری خوبصورتی میں اور تمہارے جسم میں جنسی کشش ہے۔ کوئی مرد تمہیں دیکھ لے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے اور تمہیں پا لینے کے لئے اپنی جان اور اپنی دولت داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔"

"مگر اب مجھے جنسیت سے چڑ ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو شاید کبھی غصے میں آکر اپنا چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچ لوں گی اور اسے اس قدر بھیانک بنا دوں گی کہ جو مرد مجھے دیکھ کر بے قابو ہو جاتے ہیں، وہ مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔" میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ میں نے اُسے کہا۔ "مجھ میں جو کشش ہے، یہ بدکار ماحول کا اثر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ چہرے مہرے پر پاکیزگی کا تاثر پیدا کر دوں۔ آپ مجھے کوئی ایسا ورد یا وظیفہ بتا دیں جو میں پڑھتی رہا کروں۔ مثلاً آیتہ کریمہ ہے۔ میں گناہوں میں ڈوبی رہی ہوں لیکن اس عظیم حقیقت کی منکر نہیں ہو سکی کہ نجات نماز، روزہ اور قرآن میں ہے۔ مجھے کچھ بتائیے جو میں پڑھتی رہوں اور جس سے میرا ضمیر پاک ہو جائے اور میرے چہرے سے جنسیت کی کشش پاکیزگی میں بدل جائے۔"

اس موضوع پر باتیں کرتے کرتے ہمارے درمیان کوئی حجاب نہ رہا مگر میں اسے باپ ہی سمجھتی رہی۔ میری نظر میں اس کا مقام بلند اور پُرعظمت تھا۔ اس نے مجھے نماز پڑھنے کی نصیحت کی اور کہا کہ وہ مجھے ایک وظیفہ بتائے گا۔ کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بڑے ہوٹل سے نہایت پُرتکلف کھانا دفتر میں منگوالیا اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اس کا دفتر بہت خوبصورت اور کشادہ تھا۔ ایک طرف صوفہ سیٹ اور ایک دیوان بھی رکھا تھا۔ میں برقعہ اتار چکی تھی۔ اس کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس دوران میں نے اس کے بیوی بچوں کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے دو بیٹے میری عمر کے ہیں اور ان سے چھوٹی تین لڑکیاں ہیں اور اس کی بیوی زندہ ہے۔ اس نے اپنی بیوی کا نام ایسے لہجے میں لیا جیسے کسی تُرش اور کڑوی چیز کا نام لیتے لوگ مُنہ بنا لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی بیوی سے نالاں تھا۔

"میں زندہ دل آدمی ہوا کرتا تھا۔" اس نے کہا۔ "مگر اس بیوی نے مجھے جوانی میں ہی مُردہ کر دیا تھا۔" اس نے بیوی کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول دیا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص مظلوم ہے اور اس نے بڑی ہی روکھی پھیکی زندگی گزاری ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ دن رات محنت کرتا ہے۔ یہ فرم اور یہ کارخانہ اس کی شبانہ روز محنت کا حاصل ہے مگر اسے وہ روحانی اور جذباتی سکون ساری عمر نہیں ملا جو تھکے ماندے مرد کو عورت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح اس نے مجھے بڑی طویل تفصیل سے بتایا کہ ایک تشنگی ہے جو اسے پریشان رکھتی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ دلی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ جس طرح اس نے میری مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ لیا تھا اس سے اس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا اور میری نظر میں ایک عظیم انسان بن گیا۔

وہ دن ذاتی باتوں میں گزر گیا۔ دوسرے دن میں گئی تو اس نے دوستوں کی طرح میرا استقبال کیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے دفتر میں بیٹھنے کی جگہ بتا دیں۔ اس نے جواب دیا۔ "میرے سامنے بیٹھنا تمہیں پسند نہیں؟ تمہاری جگہ یہی ہے۔" اس نے میری ڈیوٹی کے متعلق مجھے کچھ باتیں سمجھائیں۔ اپنے کاروبار کی معلومات دیں۔

ٹیلی فون سننا اور جواب دینا سکھایا اور اپنی ذاتی خط و کتابت کی فائل دکھائی۔ سب سے زیادہ ضروری جو بات اس نے مجھے بتائی وہ یہ تھی کہ اس کے تیار کئے ہوئے مال کے گاہک زیادہ تر سرکاری محکمے ہیں۔ ان محکموں کے متعلق اس نے مجھے بتایا کہ ان کے افسر وقتاً فوقتاً ٹیلی فون کرتے رہتے ہیں، انھیں خوش رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ مال کے آرڈر انہی سے ملتے ہیں۔ آدھا دن

کاروباری باتوں ہی میں گزر گیا۔ ہوٹل سے کھانا آیا جو ہم دونوں نے کھایا اور پھر ذاتی باتیں شروع ہو گئیں۔

"میری ایک بات کو غلط نہ سمجھنا" اس نے کہا۔ "تم نے اپنے دل کی باتیں میرے آگے رکھ دی ہیں اور میرے دل میں جو کچھ تھا وہ تمہارے آگے رکھ دیا ہے۔ میں نے اتنی باتیں اور اس قسم کی ذاتی باتیں کبھی کسی نے نہیں کی تھیں لیکن تمہارے انداز میں اور باتوں میں سچائی اور غم دیکھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ تم اس قابل ہو کہ تمہیں اپنا ہم راز بنا لوں میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں صرف دیکھ کر میری وہ تشنگی ختم ہو جاتی ہے جو مجھے ہر وقت بے چین رکھتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم غلط سمجھ بیٹھو گی لیکن میں صاف گو آدمی ہوں۔ میرے دکھوں کا علاج تمہارے پاس ہے۔ میں تمہیں جسمانی عیاشی کا ذریعہ نہیں بناؤں گا۔ تمہاری عزت کی حفاظت پوری طرح کروں گا۔ صرف یہ کرم کرنا کہ مجھے غلط نہ سمجھنا اور مجھ سے دور بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔"

اس کا انداز ایسا تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ میرے دل میں اترتا جا رہا تھا۔ وہ آخر میرا باپ تھا۔ میں اس سے کیوں بھاگتی میں ایسی احسان فراموش تو نہیں تھی۔ میں نے ابھی اسے یہ نہیں کہا تھا کہ میری رہائش کا مسئلہ بھی حل کر دے۔

یہ دن بھی گزر گیا۔

پھر ایک دوسرے کے پیچھے چار دن گزر گئے۔

پانچویں دن کے چار بج گئے۔ اس کے دفتر کا سارا اسٹاف چھٹی کر گیا۔ اس نے اپنے چپڑاسی کو روکے رکھا۔ اُس روز میں دیکھ رہی تھی کہ وہ اُکھڑا اُکھڑا اور تھکا تھکا سا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا۔ "جسم کی تو مجھے پروا نہیں، ایسے لگتا

ہے جیسے روح تھک گئی ہے۔ اس کا علاج میرے گھر میں ہونا چاہیئے تھا مگر میں گھر جانے سے گھبراتا ہوں۔ بیوی ایسا سلوک کرے گی کہ رہی سہی سکت بھی ختم ہو جائے گی۔" اُس نے بڑی دردناک سی آہ بھر کر کہا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ شراب تھکے ہوئے اعصاب کو سہلا لیتی ہے لیکن گناہ کرنے سے طبیعت گھبراتی ہے۔"

وہ اٹھا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ میرا وہ محسن تھا۔ مشفق تھا۔ اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ہاتھ میرے سر پر رکھ کر انگلیاں میرے بالوں میں الجھا لیں۔ پھر اس کی انگلیاں میرے بالوں میں رینگنے لگیں۔ اس نے کوئی غیر شریفانہ بات نہ کی بلکہ کہنے لگا۔ "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں تم سے زیادہ دکھی ہوں مگر تم بچی ہو۔ میں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمہارے دکھ کس طرح اپنے دل میں ڈال لوں۔" اور اس نے مجھے اس طرح اپنے قریب کر لیا کہ میرا سر اس کے سینے سے لگ گیا۔ اس نے اپنا منہ میرے بالوں پر رکھ دیا اور کہنے لگا:

"میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کسی عورت کے بال اتنے دلنشیں ہو سکتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ تم جیسے پھول کو سینے سے لگا کر دل میں حیوانی خیال کس طرح آ سکتا ہے۔ تم تو پھول ہو جس کی خوشبو روح پر لنشہ طاری کر دیتی ہے۔"

اُس پر فی الواقع نشہ طاری ہوتا جا رہا تھا اور مجھے اس کی کوئی حرکت بُری نہیں لگ رہی تھی کیونکہ اس کی کوئی حرکت حیوانی نہیں تھی۔ کم از کم مجھے ایسا شک نہیں ہُوا کہ اس کی نیت میں فتور ہے۔ اس نے جب میرا چہرہ اوپر اٹھا کہ میری دونوں آنکھوں کو باری باری چُوم کر کہا۔ "میں خدا کی قدرت کے حسن کی داد کس طرح دوں۔" تو بھی میں نے بُرا نہیں مانا بلکہ مجھے اُس بچی کی طرح سکون محسوس ہُوا جسے باپ اُٹھا کر سینے سے لگا لیتا اور اس سے پیار کرتا ہے۔ پھر اس نے گال میرے ایک گال سے لگا دیئے اور ذرا سی دیر بعد اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں پر تھے۔ میں نے پھر بھی کوئی مزاحمت نہ کی۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ مرد کے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملے ہوں مگر فرق تھا۔ بہت فرق تھا۔ اُن ہونٹوں میں حیوانیت تھی اور یہ باپ کے ہونٹ تھے۔ مجھے یہ اطمینان

بھی ہُوا کہ اس نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، اس کے عوض اسے کچھ سکون دے رہی ہوں۔ اس کا احسان صرف یہ نہیں تھا کہ اس نے مجھے تین سو روپے کی نوکری دی تھی بلکہ اصل احسان تو یہ تھا کہ اس نے میرے دُکھ اور درد کو اپنا درد سمجھا اور مجھے یہ کہہ کر ایک مقام دے دیا تھا۔ "تم بے قصور ہو، تم پاک ہو۔"

میں جب وہاں سے نکلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی روح معلوم نہیں سکون پذیر ہوتی تھی یا نہیں، میری روح ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ یہ باپ کے پیار کا خمار تھا۔

ایک افسر نے مجھے رشوت کے طور پہ مانگا

اس شام کے بعد ہر شام وہ روحانی تھکن محسوس کرنے لگا۔ صوفے پہ نڈھال ہو کے بیٹھ جاتا۔ مجھے اپنے پاس بٹھا لیتا اور میرے بالوں کو میری آنکھوں کو، میرے گالوں اور میرے ہونٹوں کو چوم چوم کر دیوانہ ہو جاتا۔ غالباً ساتواں یا آٹھواں روز تھا کہ وہ صوفے پر لیٹ گیا اور مجھے کہا کہ دیوان پہ لیٹ جاؤ۔ ذرا آرام کر لو۔ میں لیٹ گئی۔ وہ اتنا تھکا ہُوا تھا کہ سو گیا۔ ذرا سی دیر بعد میری بھی آنکھ لگ گئی اور تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کُھل گئی۔ وہ دیوان پر میرے پاس اس طرح لیٹا ہُوا تھا کہ اس کا ایک بازو میری گردن کے نیچے تھا۔ میرا مُنہ اس کے مُنہ کے ساتھ لگا ہُوا تھا اور میری ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں کے اوپر تھی۔ میں بدک تو گئی لیکن سنبھل گئی۔

روزمرّہ کی بے تکلفی کے مطابق میں ہنس پڑی۔ اس نے دوسرا بازو بھی میرے گرد لپیٹ کر مجھے اپنے اوپر ڈال لیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی لالی ہے اور یہ شخص وہ نہیں جسے میں اپنا باپ سمجھتی تھی۔ میں نے مردوں کو اس کیفیت میں بہت دیکھا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ کو یہ فریب دیا کہ نہیں، یہ بزرگ اُن آوارہ نوجوانوں سے اور اس فریب کار ڈاکٹر سے بہت بلند ہے مگر اس نے مجھے اس خود فریبی سے جلدی ہی نکال لیا۔ اُس کا ایک ہاتھ میرا آزار بند ڈھونڈ رہا تھا۔ میں ایک ہی جھٹکے سے اس کے بازو سے نکل کر اُٹھ بیٹھی۔ دل میں ایسا درد

اُٹھا جیسے اس بزرگ نے خنجر میرے دل میں اتار دیا ہو۔ میرے ہونٹ کانپنے لگے۔ زبان بند ہو گئی اور معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا۔

وہ دیوان پر نڈھال پڑا تھا جیسے اسے بھی صدمہ ہُوا ہو۔ التجا کے لہجے میں اس کے ہونٹوں سے سسکی سی نکلی۔۔۔۔ "نہیں!"

میں پھٹ پڑی۔ میں نے چلّا کر کہا۔ "نہیں۔ میں اپنے باپ کو ناپاک نہیں کروں گی۔ میں اپنے گناہگار جسم کی غلاظت کے چھینٹے آپ کی بزرگی پر نہیں پڑنے دوں گی۔"

میری آواز میں شاید ہذیانی کیفیت تھی۔ وہ اُٹھا اور اس نے مجھے گلے لگا کر کہا "مجھے معاف کر دینا۔ تم وہ شراب ہو جسے دیکھ کر زاہد کی بھی قسم ٹوٹ گئی تھی۔ میں پاپی ہوں۔"

معلوم نہیں وہ اور کیا کچھ کہتا رہا۔ میں اُس بچے کی طرح جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو، اس کے سینے پر منہ رگڑ رگڑ کر اتنی روئی کہ میری ہچکی بندھ گئی۔ اس لے معافی مانگ کر اور التجائیں کر کر کے مجھے بہلا لیا جب میری طبیعت سنبھل گئی تو میں نے اسے کہا۔ "آپ نے اپنے اوپر یہ بھوت صرف اس لئے سوار کر لیا تھا کہ میرے گناہوں سے آپ واقف ہیں مگر آپ کو یاد نہیں رہا کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو میں پڑھا کر دل اور اپنے ضمیر سے گناہوں کی گندگی دھو ڈالوں۔ میں تو آپ کو اپنا پیر استاد اور باپ سمجھ بیٹھی تھی۔"

اس نے مجھے آگے بولنے نہ دیا اور کہا۔ "اب بھی مجھے وہی سمجھو جو مجھے پہلے سمجھتی رہی ہو۔ دیکھو میں انسان ہوں اور پیاسا ہوں۔ فرشتہ نہیں ہوں۔ نیکی اور بدی میں ایک لکیر کا فرق ہوتا ہے۔ تمہیں لیٹے ہوئے دیکھا تو ایسا دھچکہ لگا کہ میں لکیر کی دوسری طرف جا پڑا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔"

اور میں نے اسے معاف کر دیا مگر دل میں ایک خلش سی بیٹھ گئی۔ وہ نہ نکلی میں نے سوچا مرد کس قدر کمزور ہوتا ہے۔ میں تو اتنی کمزور نہیں تھی۔ کئی اقسام کے نشے تھے جن کی میں عادی ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ انسان کسی نشے سے

نجات حاصل نہیں کر سکتا لیکن میں نے ایک بار ارادہ کیا تو پھر سگریٹ کے دھوئیں سے بھی متلی آنے لگی۔ میں تو سگریٹ میں چرس بھر کر پیا کرتی تھی۔ اُس رات میں سکون سے سو بھی نہ سکی۔ بار بار یہ تلخ سا خیال آ کے مجھے جگا دیتا کہ عورت ہونا جوان اور خوبصورت ہونا کتنی بڑی بدنصیبی ہے۔ جوان لڑکی اُس آدمی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتی جسے وہ باپ سمجھتی ہے۔ اس سوسائٹی میں عورت کا استعمال یہی ہے کہ گھر میں خاوند کی ہوس پوری کرتی رہے۔ بچے جنتی رہے اور جوانی میں ہی بوڑھی ہو جائے اور اگر مجبور ہو کر اپنے سہارے جینا چاہے تو ہر اُس آدمی کی بے نکاحی بیوی بن جائے جس سے اس کا واسطہ پڑے۔

میں مجبور تھی۔ صبح ہوئی تو دفتر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مجبوری تھی، چلی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے سنبھال لیا۔ وہ خود بھی سنبھل چکا تھا۔ وہ آخر جہاندیدہ آدمی اور منجھا ہُوا کاروبار دار تھا۔ اس نے مجھے الفاظ اور گفتگو کے طلسم میں اُلجھا لیا۔ اسی روز کا ذکر ہے کہ اسے کسی سرکاری محکمے کا ایک افسر ملنے کے لئے آ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ میرے ڈائریکٹر نے مجھے اس سے متعارف کرایا۔ مجھے وہ نظریں آج بھی یاد ہیں۔ جن سے اس افسر نے مجھے دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ چلا گیا تو میرے ڈائریکٹر نے مجھے بتایا کہ اس افسر سے اسے بہت سے سرکاری آرڈر ملتے رہتے ہیں۔ اب کم و بیش پونے دو لاکھ روپے کا ایک آرڈر ہے لیکن ایک اور فرم بہت بڑی سفارش اور رشوت سے یہ آرڈر لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ افسر میرے ڈائریکٹر کو یہی بتانے آیا تھا۔ دراصل آرڈر اسی افسر کے ہاتھ میں تھا۔ جسے چاہتا دے دیتا لیکن وہ رشوت کی زیادہ بولی لینے آیا تھا۔

دوسرے روز میرا ڈائریکٹر اس افسر سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ میں دفتر میں اکیلی تھی۔ کوئی کام نہیں تھا۔ ڈائریکٹر کی میز کی درازوں کی چابی میز پر پڑی تھی۔ میں نے وقت گزارنے کے لئے درازیں کھولنی شروع کر دیں میرے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ دوسری دراز میں کئی ایک کاغذات پڑے تھے۔

ان میں مجھے بڑے سائز کا ایک لفافہ نظر آیا۔ کھولا تو اس سے ننگی تصویریں برآمد ہوئیں۔ وہی تصویریں جو میں نے کتنی بار دیکھی تھیں۔ یہ میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ ان تصویروں کا بھی میری تباہی میں بہت بڑا عمل دخل تھا۔ میں اس نسل کی ایک نمائندہ لڑکی تھی جو ایسی تصویروں کی دلدادہ بلکہ انہی تصویروں کی پیداوار تھی۔ البتہ حیرت اس پر ہوئی کہ یہ تصویریں ایک بزرگ کے دراز میں رکھی تھیں اور یہ اسی نے خود ہی رکھی ہوں گی۔ کوئی اور تو نہیں رکھ گیا ہوگا۔ ان سے اس کا سارا کردار میرے سامنے آ گیا۔

میں نے تصویریں دیکھ کر رکھ دیں اور دراز بند کر دیا۔ میں اس سوچ میں گم ہو گئی کہ یہ بزرگ کتنا بڑا فریب ہے۔ اس نے پہلے میرے دکھ درد کی باتیں کیں پھر اپنی مظلومیت اور تشنگی کا اظہار کیا۔ میرے اعصاب پر اپنی شفقت کا رنگ جما کر مجھے اپنی بزرگی کے پاکیزہ جال میں الجھایا پھر بتدریج مجھے اس مقام تک لے گیا جہاں اسے توقع تھی کہ میں بلا چون وچرا اپنا آپ اس کے حوالے کر دوں گی۔ مجھے جو صدمہ ہوا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں اس سوچ میں غرق ہو گئی کہ اب کہاں جاؤں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ میں نے شریفانہ زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ یہ ارادہ اور قسم ٹوٹتی نظر آنے لگی۔

میں انہی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ وہ آ گیا۔ اچانک میرے دماغ میں یہ فیصلہ آ گیا کہ اس کی نوکری چھوڑوں گی نہیں۔ اگر اس نے پھر بھی بدنیتی کا مظاہرہ کیا تو چھوڑ دوں گی لیکن وہی دن میری نوکری کا آخری دن ثابت ہوا۔ وہ اس طرح کہ اس نے بڑا ہی پرتکلف کھانا منگوایا۔ باتوں میں ایسی غیر معمولی ہمدردی کا اظہار کیا کہ میں سمجھ گئی کہ وہ آج مجھے کسی جال میں الجھانا چاہتا ہے۔ میرا اندیشہ غلط ثابت نہ ہوا۔ اس نے تمہید باندھ کر پہلے تو اس افسر کا ذکر چھیڑا جو کل اسے ملنے آیا تھا۔ مجھ پر اس کی شرافت کی دھاک بٹھائی۔ پھر مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ میری تنخواہ تین سو نہیں چار سو روپے ہوگی۔ اور آخر میں کہا۔ "زیدی صاحب کل تمہاری باتوں سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ آج رات انہوں نے تمہیں

فلاں ہوٹل میں مدعو کیا ہے۔ کہتے تھے ذرا گپ شپ لگائیں گے۔"

"آپ نے اسے بتایا نہیں کہ میں کسی سے ملا نہیں کرتی؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن انہوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں تمہیں ان کے پاس بھیج دوں۔۔۔ تم چلی جانا۔ میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ان کے ہاتھ میں پونے دو لاکھ روپے کا آرڈر ہے۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ اگر تم آج ان کے پاس چلی جاؤ تو اس آرڈر کے علاوہ مجھے پچاس ہزار روپے کا ایک اور آرڈر دیں گے۔"

"تو انہوں نے مجھے آپ سے رشوت کے طور پر مانگا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں زبردستی نہیں بھیج سکتا۔ تم بات سمجھ گئی ہو تو مجھے کھل کر بات کرنے دو۔ یہ تمہارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ میری خاطر چلی جاؤ۔ تھوڑی سی قربانی دے دو۔ اگر دونوں آرڈر مل گئے تو کمپنی کو ایک لاکھ تیس ہزار روپے کا منافع مل جاتے گا۔"

میں نے انکار کر دیا۔

"میں تمہیں دو ہزار روپے نقد دوں گا۔" اس نے کہا۔ "وہ تمہیں پوری رات نہیں رکھے گا۔ صرف دو تین گھنٹے۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ تم ایسی لڑکی نہیں ہو۔"

دو ہزار روپے میرے لئے بہت بڑی رقم تھی، لیکن دل نے بالکل ہی نہ مانا کہ میں رشوت کے طور پر اس افسر کے پاس جاؤں۔ میں سوچنے لگی کہ پاکستان کی سرکاری مشینری ایسے ناپاک طریقے سے چل رہی ہے؟ یہی وہ لوگ ہیں جو مجھ جیسی لڑکیوں کو آوارہ اور بدکار کہتے ہیں۔ یہی وہ حکومت ہے جس نے ملک میں عصمت فروشی کے بازار بند کر دیتے ہیں، اور یہی وہ حکومت ہے جس کی افسر شاہی کا نظام عصمت فروشی پر چلتا ہے۔

"زیادہ نہ سوچو۔" اس نے کہا۔ "چلی جاؤ۔ اگر مجھ پر اعتماد نہیں تو دو ہزار روپیہ لے لو۔"

"یہ تو میں سوچ چکی ہوں کہ میں نہیں جاؤں گی۔" میں نے کہا۔ "اب

سوچ رہی ہوں کہ اس ملک میں لڑکیاں بھی رشوت کے طور پر دی اور لی جاتی ہیں!"

"اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" اس نے کہا۔ "یہ تو یہاں کا دستور ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہر روز لاکھ لاکھ روپے کے آرڈر لا سکتی ہو۔ میں منہ مانگی کمشن دوں گا۔"

میں حیران تھی کہ یہ بزرگ جس کی باتوں میں خلوص دیکھ کر اسے باپ سمجھ بیٹھی تھی بردہ فروشوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ پیش کش ٹھکرا دی۔

اس نے کہا "اگر تمہارا ماضی پاک اور صاف ہوتا تو میں تمہیں ایسی بات کبھی نہ کہتا۔ تم مجھ پر رُعب ڈالنے کے لئے شریف بن رہی ہو۔"

طلسم تو ٹوٹ ہی چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "آپ یوں کریں کہ مجھے داشتہ بنا کر رکھ لیں۔ میری رہائش کا انتظام کر دیں۔ میں پانچ ہزار روپیہ ماہوار لوں گی اور جب آپ مجھے کسی افسر کو رشوت کے طور پر دیں گے تو دو ہزار روپیہ ایک رات کا لوں گی۔ کہئے منظور ہے؟"

"افسوس تم میرے خلوص کو نہ سمجھ سکی۔" اس نے کہا۔

میں نے برقعہ اٹھایا اور جتنے دن اس کے دفتر میں جاتی رہی تھی، ان کی تنخواہ بھی نہ لی اور دفتر سے نکل گئی۔ میں اس کے خلوص کو زیادہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں اپنے دوستوں کی کوٹھی میں نہیں گئی، چلتی گئی اور باغ میں خراماں خراماں ٹہلنے لگی۔ ایک گوشے میں بنچ پڑا تھا۔ نقاب نیچے گرایا ہوا تھا۔ میں بیٹھ گئی۔ سوچنے لگی عورت کیا کر سکتی ہے؟ کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ عورت کھلونا ہے، پیسے والے اسے خریدتے ہیں، اس سے کھیلتے ہیں، دل بہلاتے ہیں۔ میں بھی کھلونا بن گئی تھی لیکن مجھے گلہ کرنے کا حق نہیں تھا کیوں کہ یہ گناہ میرے ہی تھے جن کی مجھے سزا مل رہی تھی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس ملک میں مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں ہوں گی جو میری طرح کونوں کھدروں میں پناہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں گی اور ہزاروں ہوں گی جو ہتھیار ڈال کر کسی مینجنگ

ڈائریکٹر کے ساتھ دیوان پر لیٹی ہوتی ہوں گی۔ برضا و رغبت سرکاری افسروں کے پاس رشوت بن کر چلی جاتی ہوں گی۔ ہوٹل کے کمروں میں عصمت فروشی کے اڈوں پر نیلام ہو رہی ہوں گی۔ انہوں نے بھی میری طرح گناہوں سے توبہ کر کے توبہ کی شکستہ کشتی اس سمندر میں ڈال دی ہو گی جہاں ہوس، جنسیت اور عیاشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجبور عورت کی قسمیں ٹوٹا نہیں کرتیں، توڑ دی جاتی ہیں۔

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں تو پاگل ہوں۔ میں نے اس ڈائریکٹر کی بات نہ مانی تو کیا ہوا؟ وہ مجھ جیسی کسی اور لڑکی کو دو ہزار کا لالچ دے کر پاکستان کے اس افسر کے پاس بھیج دے گا۔ جس کے ہاتھ میں ایک آرڈر پونے دو لاکھ کا اور دوسرا پچاس ہزار کا ہے۔ پاکستان کی سرکاری مشینری چلانے کے لئے ملک میں مجھ جیسی لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔ اس خیال نے مجھے آگ بگولہ کر دیا۔ میں غصے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ارادہ کر لیا کہ واپس جا کے اسے کہتی ہوں کہ لاؤ دو ہزار روپے، میں آج رات اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ پھر معلوم نہیں وہ کونسا جذبہ تھا جس نے مجھے روک دیا اور میں ان چار نوجوانوں کے پاس چلی گئی جو آوارہ تھے، اوباش تھے مگر میرے محافظ تھے۔ وہی میری پناہ تھی۔ وہ کہ جو کہ رات یورپی ہوٹلوں کے تہہ خانوں میں نت نئی لڑکیوں کے ساتھ ناچتے اور چور کمروں میں ان کے ساتھ دل بہلاتے تھے میری عصمت کے محافظ تھے۔

میرا سگا بھائی میرا گاہک بن کے آیا

انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کسی سکول میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کروں ہو سکتا ہے وہیں رہائش کا انتظام بھی ہو جائے۔ جاگیردار کے بیٹے نے مجھے بہت سے پیسے دے دیئے اور میں نے شہر کی خاک چھاننی شروع کر دی۔ کسی سرکاری سکول میں مجھے نوکری نہیں مل سکتی تھی کیونکہ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ پرائیویٹ سکولوں کا اتا پتہ نہیں تھا۔ یہ زیادہ تر محلوں میں تھے۔ میں نے شہر کے ایک طرف سے سکولوں کی تلاش شروع کی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ تلاش مجھے بے حال کر دے گی لیکن مجھے جگہ جگہ پرائیویٹ سکول نظر آئے۔ پرائمری، کہیں مڈل اور کہیں ہائی سکول۔ بعض لوگوں نے تو گھروں میں ہی سکول کھول لئے تھے۔ خاوند سکول کا منیجر یا کلرک بنا ہوا تھا اور بیوی ہیڈ مسٹریس۔ ایک وہ سکول تھا جس میں میں پڑھی تھی۔ بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کے بچوں کا سکول اور ایک یہ سکول جن کے ایک ایک کمرے میں سو سو بچے فرشوں پر بٹھائے ہوتے تھے۔ کمرے تنگ و تاریک اور غلیظ، بچے کمروں سے زیادہ غلیظ۔ غریب والدین بچوں کو ان سکولوں میں داخل کرانے پر مجبور تھے۔ یہاں انہیں داخلہ تو مل جاتا تھا۔ یہ سکول درس گاہیں نہیں تجارتی ادارے ہیں۔

میں جس محلے میں گئی۔ مجھے وہاں ایک سکول نظر آیا۔ میں نے ہر سکول میں جا کر ہیڈ مسٹریس سے نوکری مانگی اور بتایا کہ تھرڈ ایئر تک پڑھی ہوں مگر چار

سکولوں سے مجھے صاف جواب مل گیا۔ میں نے سارے شہر کی خاک چھان ماری۔ سکولوں کی تو کمی نہیں تھی، کمی نوکری کی تھی۔ ایک سکول نے صرف ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پیش کی اور ایک نے سو روپیہ۔ یہ تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔ میں کسی اور پرائیویٹ کمپنی میں چلی جاتی تو اس سے تین گنا تنخواہ لے سکتی تھی لیکن میں مردوں کی ہوس کاری سے دُور رہنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ میں جوان اور خوبصورت ہوں، اور میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں بے سہارا گھر سے بھاگی ہوئی اور مجبور تھی۔ میں مان نہیں سکتی تھی کہ اس معاشرے میں کوئی مرد ایسا ہو گا جو مجھے اپنی بیٹی یا بہن سمجھے گا۔ اسی خطرے کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی سکول میں استانی بن جاؤں گی۔ الگ مکان لے کر شریفانہ زندگی بسر کروں گی۔ کوئی شریف آدمی مل گیا تو اس سے شادی کر لوں گی۔ محلے کی چند ایک بچیوں کو گھر میں پڑھایا کروں گی۔ میں دراصل اپنے آپ کو بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کرنے کا عزم کر چکی تھی مگر مجھے باعزت طریقے سے الگ مکان میں رہنے کے لئے اچھی تنخواہ کی ضرورت تھی۔

وہ چاروں لڑکے مجھے ابھی تک سنبھالے ہوتے تھے۔ میں یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ ان کی کوٹھی کے اردگرد کی کوٹھیوں والے مجھے اس وقت تجسس کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے جب میں کوٹھی میں جاتی یا باہر آتی تھی۔ میرا نقاب ہمیشہ نیچے ہوتا تھا۔ باہر کے کسی انسان نے کبھی میرا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کسی کو یہ اعتراض نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک عورت چار جوان لڑکوں کے ساتھ رہتی ہے کیونکہ ہم نے کوٹھی میں کبھی کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی اور اُودھم نہیں مچایا تھا۔ ایک روز میں نے خانسامے سے پوچھا تھا کہ اردگرد کے لوگ اس سے ضرور پوچھتے ہوں گے کہ میں کون ہوں۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک بار نہیں کتنی لوگ کتنی بار پوچھ چکے ہیں۔ خانساماں برخوردار قسم کا انسان تھا۔ اس نے سب کو بتایا کہ میں جاگیردار کے بیٹے کی بہن ہوں اور کالج میں پڑھتی ہوں۔ اس احتیاط کے باوجود میں اب وہاں سے جلدی نکل جانا چاہتی تھی مجھے اس شہر سے ہی نکل جانا چاہیے تھا۔ شہر اتنا بڑا ہے کہ کوئی کسی کو

ڈھونڈ نہیں سکتا۔ پھر بھی خطرہ تھا کہ میرے والد صاحب، بھائی یا محلے کا کوئی اور آدمی مجھے پہچان لے گا مگر سوال یہ تھا کہ جاتی کہاں؟ ایک روز یہ خطرہ میرے سر پہ پہنچ ہی گیا۔ اس روز میں چار سکولوں میں گئی تھی۔ سارا دن گلی گلی بستی بستی گھومتے شام ہو گئی تھی۔ میں رکشا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ لوگ میرے قریب سے گزر رہے تھے۔ ایک سکوٹر میرے قریب آ کر بہت آہستہ ہو گیا۔ اس پر دو نوجوان سوار تھے۔ آگے میرا چھوٹا بھائی اور پیچھے اس کا دوست تھا۔ دونوں نے مجھے دیکھا اور آگے چلے گئے۔ میرا نقاب نیچے تھا۔ سکوٹر ذرا آگے جا کر رک گیا۔ پیچھے بیٹھا ہوا لڑکا اتر گیا اور میرا بھائی سکوٹر واپس لایا۔ مجھے یہ ڈر پیدا ہوا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ میں وہاں سے چل پڑی۔ سکوٹر میرے قریب آ گیا۔ بھائی نے آہستہ سے کہا۔ "آؤ۔" میں سمجھ گئی کہ وہ شکار ڈھونڈ رہا ہے۔ میں کچھ نہ بولی تا کہ وہ سمجھ جائے کہ یہ شریف عورت ہے لیکن وہ میرے پیچھے پڑا رہا۔

جی میں آئی کہ گالی گلوچ کر کے اسے دھتکار دوں، لیکن میری پوزیشن کمزور تھی۔ میں رک گئی اور دھیمی سی آواز میں اسے کہا۔ "تم ابھی بچے ہو۔ اسی عمر میں کس چکر میں پڑ گئے ہو؟" اُس وقت اس کی عمر ۲۲، ۲۳ سال ہو گی۔ اس سے جدا ہوتے ایک سال ہو گیا تھا۔

"میں بچہ ہوں؟" اس نے کہا۔ "اتنا جوان ہو گیا ہوں۔ تم چہرہ نہ دکھاؤ تو بھی مجھے پتہ ہے کہ میری عمر کی لڑکی ہو۔ تمہارے ہاتھ اتنے پیارے ہیں۔ آؤ بڑے اچھے ہوٹل میں چلیں گے۔ کمرہ مل جائے گا۔"

مجھے ہچکی سی آئی مگر ہونٹوں میں جکڑ لی۔ یہ میرا بھائی تھا۔ اتنا پیارا بھائی۔ میں اسے گلے لگا لینے کے لئے بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ ایک سیکنڈ میں مجھے اگست ۱۹۴۷ء یاد آ گیا جب ہم ہندوستان سے پا پیادہ آتے تھے۔ میرے اس بھائی کی عمر بارہ سال تھی۔ وہ اسی عمر میں جوان ہو گیا تھا۔ اس نے بھوک پیاس اور تھکن اپنے ننھے سے جسم میں جذب کر لی تھی۔ وہ رویا نہیں تھا بلکہ میں روتی تھی، وہ مجھے بہلا لیتا تھا اور مجھے کہتا تھا کہ پاکستان بہت خوبصورت ہے۔

ہمیں وہاں پاکستان جتنا خوبصورت گھر ملے گا۔ ایسی پیاری پیاری حوصلہ افزا باتوں سے وہ مجھے بہلاتا لاتا تھا مگر اتنے خوبصورت پاکستان میں آکر ہم بہن بھائی کتنے علیحدہ ہو گئے تھے۔ بہن بھی آوارہ بھائی بھی آوارہ اور بھائی اپنی بہن کو ہوٹل کے کمرے میں جنسی ہوس پوری کرنے کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔ اسے پاکستان کا وارث اور محافظ بننا تھا مگر وہ کیا بن گیا تھا۔

میرے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے کہا "سوچتی کیا ہو؟ آؤ چلیں۔ ہم دوہیں۔ کھانا کھلائیں گے۔ وہسکی پلائیں گے۔ منہ مانگے پیسے دیں گے۔"

میرا دل شاید میرے حلق میں آگیا تھا۔ میں کچھ بھی نہ بول سکی۔ خاموشی سے چل پڑی۔ وہ مجھے بلاتا رہا۔ میں چلتی رہی۔ اچھا ہوا کہ ایک رکشا میرے اشارے پر رک گیا اور میں دوڑ کر اس میں بیٹھ گئی۔ اُس رات میں بہت دیر تک روتی رہی۔ بھائی آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ گھر کے سارے فرد یاد آتے۔ میں ہار گئی تھی۔ کئی بار یہ ارادہ بھی دماغ میں آیا کہ گھر چلی جاؤں اور والد صاحب کے پاؤں میں جاکر سر رکھ دوں۔ انہیں کہوں کہ مجھے بخش دو۔ سینے سے لگا لو۔ اُسی طرح کندھے پر اُٹھا لو جس طرح ہندوستان سے اٹھا لائے تھے مگر میں نے اس ارادے کو کچل ڈالا۔ مجھے والد صاحب کی وہ گالیاں یاد آگئیں جو انہوں نے طلاق کے وقت مجھے دی تھیں۔ مجھے اُن کی وہ نظریں بھی یاد آئیں جن میں نفرت اور حقارت تھی۔ ایک سال کی غیر حاضری کے بعد وہ مجھے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

میری ذہنی کیفیت ایسی بگڑی کہ میں نے بلند آواز سے کہا "میں کسی کی بیٹی نہیں، میں کسی کی بیٹی نہیں" اور میں تنہا کمرے میں بہت دیر تک روتی رہی۔

یہ سکول تھا یا چکلہ؟

اگلے روز میں شہر کے ایک اور حصے میں کسی اور سکول کی تلاش میں چلی گئی۔ وہاں دو سکول تھے۔ ایک سے جواب مل گیا۔ دوسرے میں گئی تو اس کی ادھیڑ عمر ہیڈ مسٹریس نے مجھے بٹھا لیا۔ منجھی ہوئی عورت معلوم ہوتی تھی۔ یہ سکول آٹھویں جماعت تک تھا اور صرف لڑکیوں کے لئے۔ ایک پرانی حویلی تھی جس کے اُوپر ایک اور منزل تھی۔ نیچے سکول تھا۔ ہیڈ مسٹریس اوپر کی منزل میں رہتی تھی۔ وہ بیوہ تھی۔ اس سکول کا مالک، ناظم اور سب کچھ اسی عورت کی عمر کا ایک آدمی تھا جس کے متعلق پتہ چلا کہ یونین کونسل کا چیئرمین ہے۔ وہ ایوب کا دَور تھا جب بی ڈی ممبر اور یونین کونسل کے چیئرمین قانون اپنے ہاتھ میں لے کر من مانی کرتے تھے اور کوئی شہری ان کی دھاندلیوں کے خلاف اشارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حویلی کے بوسیدہ اور بدبودار کمروں میں بچیاں چٹائیوں پر اس طرح ایک دوسری کے ساتھ جُڑ کر بیٹھی ہوتی تھیں جیسے بکس میں سامان ٹھونسا ہوا ہو۔ شور و غل ناقابل برداشت تھا۔ یہ انہی سکولوں میں سے ایک تھا جن سے مجھے نفرت ہوا کرتی تھی، اور آپ کو بھی ان سے یقیناً نفرت ہوگی۔ ان سکولوں میں یہی خوبی ہے کہ آپ کے بچوں کو ان میں داخلہ مل جاتا ہے۔ ادھیڑ عمر ہیڈ مسٹریس نے مجھے بٹھا لیا۔ مجھ سے ذاتی سوال پوچھے جن کے میں نے جھوٹے جواب دیئے۔ اس کے انداز اور باتوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس نے مجھے نوکری کے لئے منتخب نہیں کیا بلکہ پسند کر لیا ہے اور اسے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ میں کون ہوں، کہاں رہتی ہوں اور کیا ہوں۔ اس نے

کہا۔ "چوہدری صاحب ابھی آجاتے ہیں۔ تنخواہ وغیرہ وہی مقرر کریں گے۔" پھر اس نے چوہدری صاحب کی تعریفیں ایسی بے دریغ کیں کہ میں انہیں فرشتہ سمجھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد چودھری صاحب آگئے۔ ہیڈ مسٹریس نے میرا تعارف کرایا اور میرا مدعا بیان کیا۔ چوہدری صاحب نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور حاکمانہ لہجے میں بولے۔ "میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں بہت سخت ہوں۔ والدین اپنی بچیوں کو اس امید پر یہاں بھیجتے ہیں کہ ہم ان کے روشن مستقبل کی بنیاد رکھیں گے اور ان کے کردار کا ڈھانچہ صاف ستھرا اور مضبوط بنائیں ... تمہیں یہ ذمہ داری پوری دیانتداری سے نبھانی ہوگی۔ میں تمہیں دو سو روپے تنخواہ دوں گا۔ پانچویں جماعت کی انگریزی اور حساب لے لو۔ میں تین مہینے تمہارا کام دیکھوں گا۔ اگر ہیڈ مسٹریس کو تم نے مطمئن کر دیا تو میں تمہیں مستقل کر دوں گا۔ ہو سکتا ہے کچھ ترقی بھی دے دوں۔"

مجھے اس کی باتیں بہت ہی اچھی لگیں۔ میں بھی بچیوں کے کردار کا ڈھانچہ صاف ستھرا اور مضبوط بنانا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی میری منزل ہے۔ میں نے دو سو روپیہ تنخواہ قبول کر لی۔ مجھے میری کلاس دکھا دی گئی۔ پتہ چلا کہ پہلی استانی نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ میں نے اس روز ہیڈ مسٹریس سے ضروری ہدایات لیں۔ پانچویں جماعت کی انگریزی اور حساب کی کتابیں دیکھیں۔ تھوڑی دیر کے لئے کلاس میں گئی، پڑھایا اور چھٹی ہو گئی۔ تمام استانیوں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے خاص طور پر دیکھا تمام استانیاں جوان اور خوب صورت تھیں۔ اس قسم کے دوسرے سکولوں میں میں نے یہ بات نہیں دیکھی تھی۔ بعض استانیاں چپڑاسیوں کی بیویاں لگتی تھیں۔ اس سکول کی استانیوں میں دوسری خوبی یہ دیکھی کہ پھکڑپن کی حد تک شگفتہ مزاج تھیں۔ انہوں نے پہلی ملاقات میں ہی ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ ایک نے کہا۔ "چوہدری صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ تمہاری تنخواہ جلدی زیادہ کر دیں گے۔"

ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ شوخ اور منہ پھٹ تھی، بولی۔ "اتنے

اچھے تمہارے بال اور ایسی مستانی آنکھیں ہوں تو چوہدری صاحب تنخواہ کیوں نہیں زیادہ کریں گے۔" سب نے قہقہہ لگایا۔ میں بھی ہنس پڑی۔ میں ایک طویل مدت بعد ہنسی تھی۔ اس سے میرے کھچے تنے ہوئے اعصاب کو خاصا سکون ملا۔ میں تو ایسے سکون کے لئے ترس گئی تھی۔ میری زندہ دلی بیدار ہو گئی، اور کچھ دیر ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ میں ویسے بھی خوش ہی تھی۔ مجھے سکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ اب رہائش کا مسئلہ رہ گیا تھا۔ یہ بھی مجھے حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ہیڈ مسٹریس بالائی منزل میں رہتی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چند دنوں بعد اسے کہوں گی کہ مجھے اپنے ساتھ رکھ لے۔

استانیاں گھر کو روانہ ہوئیں تو یہ شوخ لڑکی جس نے میرے بالوں اور آنکھوں کی تعریف کی تھی میرے پاس رُکی رہی۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنے گھر لے چلو یا میرے گھر چلو۔ سکول کے متعلق کچھ بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔" میں اس کی سنجیدگی سے ٹھٹکی اور اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔ وہ شادی شدہ تھی لیکن مجھے سسرال کی بجائے اپنے ماں باپ کے گھر لے گئی۔ کھانا کھلایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں شادی شدہ ہوں یا نہیں۔ کیا میں نوکری کرنے پر مجبور ہوں؟ میں نے اسے بتایا کہ شادی شدہ نہیں ہوں اور مجبور ہو کر نوکری کر رہی ہوں۔

"اگر بہت مجبور ہو تو ضرور نوکری کرو۔" اس نے کہا۔ "اور اگر تمہیں اپنے ماں باپ کی شرافت اور اپنی عزت عزیز ہے تو یہاں نوکری نہیں کر سکو گی۔ چند دنوں بعد تمہیں یہاں سے مایوس ہو کر جو نکلنا پڑے گا، اس لئے بہتر یہ ہے کہ سکول نہ جاؤ۔"

میں اس کی اس بات سے ہی مایوس ہو گئی۔ وہ میری عمر کی لڑکی تھی۔ اس نے کہا۔ "اگر تمہیں میری باتیں بُری لگیں یا تمہارے دل میں کوئی شک ہو تو چند دن نوکری کر کے دیکھ لو۔ پھر تمہیں میری باتوں کی سچائی کا علم ہو جائے گا۔"

"تم بات کرو۔" میں نے کہا۔

"چوہدری نے تمہارا کوئی سرٹیفکیٹ دیکھ کر تمہیں نوکری نہیں دی۔" اس

نے کہا۔ "تمہاری تعلیم دیکھ کر تمہیں پانچویں جماعت نہیں دی۔ تمہارے پاس صرف یہ سرٹیفکیٹ ہے کہ تم جوان اور خوبصورت ہو۔ چوہدری صرف یہی وصف دیکھا کرتا ہے۔ تمہیں جس استانی کی جگہ دی گئی ہے، اُسے چوہدری نے نکال دیا تھا کیونکہ اُس نے اس کی تفریح کا ذریعہ بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس چوہدری کی ہوس کاری سے کوئی استانی محفوظ نہیں۔"

"اور تم؟" میں نے بلا جھجک پوچھا۔ "کیا تم محفوظ ہو؟"

"نہیں۔" اس نے بھی میری طرح بلا جھجک کہا۔ "لیکن اس میں چوہدری کا کوئی کمال نہیں کہ اس نے مجھے رام کر لیا ہے۔ میں خود ہی ایسی ہوں۔ تم مجھے آوارہ کہہ لو۔ عیاش کہہ لو۔ میں سب کچھ ہوں۔ میں شریف لڑکی نہیں ہوں۔ تم شاید حیران ہو رہی ہو کہ میں نے پہلی ملاقات میں ہی تمہیں ہمراز سہیلی سمجھ کر راز کی باتیں بتانا شروع کر دی ہیں۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں کنواری لڑکی سمجھ کر اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ تمہیں اس خطرے سے بچا لوں۔ تم اتنی خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکی ہو کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ تمہیں ایک عیاش چوہدری ناپاک کر دے۔"

اُس نے جب مجھے کنواری اور بھولی بھالی کہا تو میرے دل سے ہوک اُٹھی۔ دل درد سے تڑپ اُٹھا مگر میں چپ رہی۔ اس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھ پر جو بیتی ہے وہ سنو گی تو جان جاؤ گی کہ میں اپنی کرتُوت سے پردے کیوں اٹھا رہی ہوں۔ سکول کی باتیں بعد میں سناؤں گی۔ پہلے میری سُن لو۔ ماں باپ نے میری شادی ایک ایسے آدمی کے ساتھ کر دی ہے جو دماغی لحاظ سے معذور ہے۔ تم اسے پاگل کہہ سکتی ہو۔ میرا باپ کاروباری آدمی ہے۔ میرا جہیز اور زیورات چالیس ہزار روپے کی مالیت کے ہیں لیکن اس حقیقت کو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ میرے ماں باپ کو چالیس ہزار روپیہ میرے سسرال نے دیا تھا۔ وہ دولت مند لوگ ہیں۔ ان کا بیٹا پیدائشی پگلا ہے۔ ظاہری طور پہ پگلا نظر نہیں آتا۔ ہنستا رہتا ہے، بابچوں کی طرح حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ ایسا ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس کے لئے انہوں نے کئی گھروں سے رشتے مانگے اور ہر جگہ سے انکار ہُوا۔ ایک گھر سے تو انہیں طعنے بھی سننے پڑے تھے۔ اس پگلے کے باپ نے ان کا چیلنج قبول کر کے کہا تھا کہ دیکھنا، میں تمہارے سامنے ایک مہینے کے اندر اندر اپنے بیٹے کو بیاہوں گا....

"میں کوئی ایسی سیدھی سادی اور گھُٹن کی ماری ہوئی لڑکی نہیں تھی جیسی گھروں کی قیدی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ میں ہنسوڑ اور کھلنڈری تھی، لاپروا اور شرارتی تھی لیکن غیر مرد کا یا بدمعاشی کا کبھی ذہن میں خیال بھی نہیں آیا تھا۔ البتہ والدین کی مالی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا تھا۔ انہیں میری جوانی کھائے جا رہی تھی۔ میری چلبلی عادتیں دیکھ کر وہ شاید مجھے جلدی بیاہ دینا چاہتے تھے۔ مگر ان کے پاس جہیز بنانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا باپ کاروباری آدمی ہے لیکن امیر تاجر نہیں۔ ایک روز اچانک مجھے بتایا گیا کہ پندرہ دنوں بعد میری شادی ہو رہی ہے۔ ماں نے مجھے میرے ہونے والے دولہا کے متعلق اتنی خوب صورت باتیں بتائیں کہ میں اپنی قسمت پر ناز کرنے لگی۔ ماں کی یہ بات تو مجھے بہت ہی پسند آئی کہ میرا دولہا میری طرح ہر وقت ہنسنے کھیلنے والا آدمی ہے ....

"میرے پوچھنے پر بھی میرے والدین نے مجھے نہ بتایا کہ اچانک اتنی دولت کہاں سے آ گئی ہے کہ میرے لئے اتنا زیور، قیمتی کپڑے اور جہیز کی اتنی زیادہ چیزیں آ رہی ہیں۔ میرے ماں باپ خوش تھے جس سے میں مطمئن تھی کہ انہوں نے قرض نہیں لیا۔ بارات کا دن آ گیا۔ معلوم ہُوا کہ پانچ سو آدمیوں کی بارات آ رہی ہے۔ بارات آئی۔ بڑی شان و شوکت سے میری شادی ہوئی اور مجھے ڈولی میں بٹھا کر لے گئے۔ میں دلہنوں کی طرح کمرے میں گھونگھٹ میں چھُپی بیٹھی تھی۔ مجھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ ایک انسان کے نہیں، کم از کم دو تین انسانوں کے قدم تھے۔ مجھے سرگوشیاں بھی سنائی دیں۔ تیز چلتے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دی اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً بعد مجھے قہقہہ سنائی دیا۔ پھر بڑی زور کی آواز گرجی ــــ بے بے اُے کی اے ــــ یہ میرے دولہا کی آواز تھی۔ وہ اپنی ماں کو بُلا رہا تھا۔ اُس نے دروازے

پر جا کر تھپڑ مارے، بے بے، بے بے پکارا۔ وہ پھر میرے قریب آیا اور مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں پلنگ پر لڑھک گئی۔ وہ ہنسا۔ میں نے گھونگھٹ اُٹھا دیا۔ وہ اچھا خاصا خوبرو لڑکا تھا جسم بھی اچھا تھا۔ پھر میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس نے کیسی کیسی حرکتیں کیں۔ کبھی ہنسنے لگتا اور کبھی میرے سینڈل اٹھا کر اُوپر پھینکنے اور پکڑنے لگتا تب مجھے یاد آگیا کہ گھر میں اور محلے کی عورتوں میں کبھی کبھی ایک پگلے لڑکے کا ذکر آیا کرتا تھا کہ اتنا خوبرو جوان پگلا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اس کے والدین اسے بیاہنا چاہتے ہیں لیکن اسے کوئی رشتہ نہیں دیتا میں سمجھ گئی کہ یہ وہی پگلا ہے....

"پھر بھی میں نے اپنے اوپر جبر کیا اور دل میں طے کر لیا کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کروں گی۔ ہوسکتا ہے میری قسمت جاگ اُٹھے اور اسے شادی ہی راس آجائے۔ میں نے اسے پاس بٹھایا۔ پیار کیا۔ بہت جتن کئے مگر وہ زور سے قہقہہ لگاتا یا ہوا میں ہاتھ بڑھا بڑھا کر معلوم نہیں کیا پکڑنے کی کوشش کرتا۔ میں اسے دوسری طرف لے آئی۔ اُسے اُبھارنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ پتھر تھا۔ اس کی کوئی حس بیدار نہیں تھی۔ میری ازدواجی زندگی کی پہلی رات کا باقی حصہ روتے گزر گیا اور وہ بڑے مزے سے دوسرے پلنگ پر سویا رہا....

"صبح ہوئی تو میری ساس اور ایک نند کمرے میں آئی۔ مجھ سے پوچھا کہ رات کیسی گزری ہے۔ میں رو پڑی اور انہیں بتایا کہ میرے ساتھ تم سب نے دھوکہ کیا ہے۔ پھر بھی میں نے اس کا دماغ ٹھکانے لانے کی پوری کوشش کی ہے مگر یہ بالکل پاگل ہے۔ اسے اتنا بھی احساس نہیں کہ یہ مرد ہے اور میں عورت ہوں۔ یہ سن کر میری ساس ہاتھ جوڑ کر میری منتیں کرنے لگی کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اسے ٹھکراؤں یا دھتکاروں نہیں۔ میں نے اپنے گھر آکر اپنے ماں باپ کو بھی خوب سنائیں۔ صرف گالیاں نہیں دیں، باقی کسر کوئی نہ رہنے دی۔ ماں نے مجھے لے جا کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور صاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ میرے جہیز کے لئے کچھ بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ انہوں نے میرے سسرال کے خرچ پر میرا جہیز بنایا اور میری شادی کی ہے۔ بارات کی روٹی کے اخراجات بھی میرے سسرال نے دیئے تھے۔ تو ہُوا یہ کہ سسرال نے اپنا پاگل بیٹا بیاہ لیا

اور میرے ماں باپ بیٹی کے فرض سے فارغ ہوگئے....

"جہنم بنی تو میری زندگی بنی۔ میں نے اپنے پاگل خاوند کو ٹھیک کرنے کے بہت جتن کئے مگر اس کے دماغ میں کوئی پیدائشی نقص ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہوسکا۔ اس کا جسم اس کے سوا اور کسی کام کا نہیں ہے کہ کھاتا، پیتا، سوتا اور ہنستا ہے یا بچوں کی طرح ہر چیز کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے یا وہ چارپائی پر بیٹھ کر ہوا کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ چونکہ اس کے ماں باپ بھی مجرم تھے اور میرے ماں باپ بھی اس لئے وہ میری مٹھی چاپی کرنے لگے۔ میں ان سب پر سوار ہوگئی اور ایک بار ذرا سی بات پر میں نے سسرال اور میکے کو یہ دھمکی بھی دے دی کہ میں عدالت میں چلی جاؤں گی اور مقدمہ دائر کر دوں گی کہ مجھے دھوکہ دے کر ایک پاگل کے ساتھ بیاہ دیا گیا ہے....

"مجھ پر کسی نے جبر نہیں کیا۔ میں میٹرک پاس کر چکی تھی۔ گھر میں دل نہیں لگتا تھا۔ بلکہ دل کُڑھتا تھا۔ میں نے کوئی باہر کی مصروفیت پیدا کرنے کے لئے اس سکول میں ملازمت کر لی۔ مجھے یہاں ایک سال ہو گیا ہے۔ یہاں یہ چوہدری مل گیا۔ یہ زندہ دل اور عیاش آدمی ہے۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ بے تکلف کرنے کی کوشش کی تو میں اس کے ساتھ کھل گئی۔ میرے اندر کوئی ایسی آگ تھی جو مجھے مجبور کر رہی تھی کہ یہ کوئی بُری بات نہیں۔ میرے ساتھ دھوکہ ہُوا تھا۔ ایک پاگل کے والدین نے برادری اور سوسائٹی میں اپنی ناک رکھنے کے لئے مجھے خریدا تھا۔ میرے باپ نے مجھے بیچا تھا۔ میرا صبر دیکھو کہ میں نے اس پاگل کو ہی قبول کر لیا مگر میری بدنصیبی کہ وہ میرے لئے جذباتی لحاظ سے بھی اور جسمانی لحاظ سے بھی بیکار ثابت ہُوا۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ وہ جسمانی لحاظ سے بیکار ہے ورنہ میرے جو بچے پیدا ہوتے وہ بھی باپ کی طرح پیدائشی پگلے ہوتے — کیا میں انسان نہیں ہوں؟ میرے کوئی جذبات نہیں ہیں؟ کیا میں پتھر ہوں؟"

حویلی کی بالائی منزل

وہ بولتی جارہی تھی۔ میں اس سے کوئی بات پوچھ لیتی تھی تو وہ وضاحت کر دیتی تھی۔ اس کے جذبات کو میں بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ بلکہ محسوس بھی کر رہی تھی۔ وہ جوان لڑکی تھی۔ خوبصورت بھی تھی۔ اس کے اندر جو آگ تھی وہ عورت کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس نے اتنے بڑے حادثے کو جس نے اس کی ساری زندگی تباہ کر دی تھی، ہنسی مذاق، شوخیوں اور عیاشی کے بل بوتے پر برداشت کر لیا تھا۔ آپ کی نگاہ میں مجرم یہی لڑکی ہوگی یا سکول کا چوہدری لیکن ایسی لڑکیوں اور ایسے چوہدریوں کو جنم کون دیتا ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے نہ دیں۔ اپنے آپ کو دیں۔ اگر میں علم نفسیات کی ڈاکٹر ہوتی تو اس سوال کا تجزیہ پیش کرتی۔

اس لڑکی نے سنایا: "میں نے سکول میں ملازمت صرف وقت گزارنے کے لئے کی تھی لیکن یہاں مجھے وہ مسرت بھی مل گئی جس سے مجھے محروم کر دیا گیا تھا۔ چوہدری نے مروت اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں اس کی توقع کے خلاف اس کے ساتھ فوراً بے تکلف ہوگئی اور ایک روز مجھے کلاس سے بلا کر وہ۔ مجھے بالائی منزل میں لے گیا۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ مرد کے لمس میں کیا سرور ہوتا ہے۔ اس نے مجھے وہ سرور دے دیا جو مجھ سے چھین لیا گیا تھا اور جو میرے ماں باپ نے چالیس پچاس ہزار روپے کے عوض ایک دولت مند کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ پھر میری اور اس کی دوستی پکی ہو گئی۔ میں ایک بار اس کے ساتھ مری چلی گئی تھی۔ گھر والوں کو بتایا تھا کہ استانیاں جا رہی ہیں۔ میں چوہدری کے ساتھ آٹھ روز مری رہی۔ مجھے کسی نے نہیں روکا

تھا کوئی روک کر تو دیکھے میں اپنے سسرال اور اپنے ماں باپ کو سارے شہر میں ننگا کر دوں گی۔ انہیں عدالت میں لے جا کر ذلیل کروں گی۔ میں اُس مولوی کی داڑھی نوچ لوں گی جس نے نکاح پڑھایا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ لڑکا پاگل ہے، اور قرآن کی رُو سے پاگل آدمی کسی کا خاوند نہیں بن سکتا۔ یہی مولوی لاؤڈ سپیکروں پر وعظ سنایا کرتا تھا۔ میں جمعے کے روز اس کی چیختی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنا کرتی ہوں۔ میں اس مولوی پر اور اس کی قبیل کے تمام مولویوں پر لعنت بھیجتی ہوں۔"

مجھے معلوم نہیں کہ اب یہ لڑکی کہاں ہے اور اس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو اور شریفانہ زندگی گزار رہی ہو مگر مجھے یقین نہیں کہ ایسا ہُوا ہوگا کیونکہ بدکاری میں وہ بہت دُور نکل گئی تھی۔ بہت شوخ، شرارتی اور دلیر لڑکی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری لائن پر چل نکلی ہو، اور ہر رات ایسے خاوند ڈھونڈ لیتی ہو جو پیدائشی پاگل نہیں ہوتے۔

آپ حیران نہ ہو جائیں۔ اس لڑکی کا یہ ردِعمل غیر معمولی، بے مثال اور حیران کن نہیں۔ یہ پاکستانی سوسائٹی، اسلامی مملکت کے معاشرے کی معمولی سی ایک مثال ہے۔ مجھ سے پوچھیے میں آپ کو بتاؤں گی کہ جہاں لڑکیاں خدا اور رسول صلعم کے نام پر مولویوں کے ہاتھوں فروخت ہوتی ہیں جہاں بیس سال کی لڑکی ساٹھ سال کے بوڑھے کو دے دی جاتی ہے، جہاں شوخ اور جوان لڑکی پاگل کی بیوی بنا دی جاتی ہے، وہاں ایسے ایسے واقعات ہوتے ہیں جنہیں رات کی تاریکیوں کے سوا اور کوئی نہیں دیکھ سکتا، اور یہ دھتکاری ہوئی بدکار عورتیں جنہیں آپ طوائف، رنڈی، بیسوا، عصمت فروش اور نہ جانے کیا کیا نام دھرتے ہیں، اگر آپ ان کے سینوں میں اور ان کے ماضی میں جھانکیں تو یہ طوائفیں اور بیسوائیں آپ کو آپ ہی کی تخلیق نظر آئیں گی۔

اس لڑکی نے مجھے بتایا کہ سکول کی ساری استانیاں چوہدری کی تفریح کا ذریعہ ہیں۔ انہیں سکول سے تنخواہ الگ ملتی ہے اور چوہدری انہیں الگ الاؤنس بھی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ہر استانی جوان اور خوبصورت

ہے۔ حویلی میں پیچھے بچیوں کو تعلیم دی جاتی ہے اور اوپر کی منزل میں بدکاری ہوتی ہے۔ یہ استانیاں جو آپس میں ہنستی کھیلتی نظر آتی ہیں اندر سے پھٹی ہوتی ہیں۔ ایک دوسری کی دشمن ہیں۔ یہ تمہاری بھی دشمن بن جائیں گی۔ اس نے بتایا کہ یہاں کی ہر استانی ایک ایک کہانی کی کردار ہے۔ کوئی اپنے معذور اور بوڑھے باپ کی جگہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی روزی کا ذریعہ ہے۔ کوئی بے روزگار یا نکھٹو خاوند کی بیوی ہے اور کوئی کسی نہ کسی وجہ سے آوارہ اور بدکار ہے۔

یہ داستان سننے کے باوجود میں نے اس سکول میں نوکری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ استانیوں کو متحد کر کے انہیں چوہدری اور ہیڈ مسٹریس کے خلاف ایک محاذ پر کھڑا کر دوں گی مگر میرا یہ وہم تھا خوش فہمی تھی۔ میں نے یہاں تقریباً ایک مہینہ نوکری کی۔ بچیوں کو پڑھانے میں مجھے بڑا پیارا سکون ملتا تھا لیکن سکول کی فضا اس قدر غلیظ تھی کہ میرے عزم تباہ ہوگئے۔ میری سہیلی صرف یہ لڑکی تھی۔ میں نے دوسری استانیوں کو چوہدری اور ہیڈ مسٹریس کے خلاف صف آرا کرنے کی کوشش کی بچیوں کے مستقبل کے واسطے دیئے، ہر جتن کر دیکھا مگر نتیجہ یہ ہُوا کہ تمام استانیاں میرے خلاف ہوگئیں اور میری سہیلی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے مجھ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ میں اپنی شکل وصورت کی کشش کی وجہ سے چوہدری کی اکیلی مالک بننا چاہتی ہوں۔

اس دوران چوہدری باقاعدگی سے سکول آتا رہا۔ مجھے ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں بلا لیتا۔ ہیڈ مسٹریس دفتر سے نکل جاتی تھی۔ بات میری ڈیوٹی سے شروع کرتا اور ذاتی باتوں تک آ جاتا۔ میں اس کے اشارے سمجھتی تھی۔ ایک روز اس نے مجھے کہا "آؤ اوپر چلیں"۔ میں نے جواب دیا "جو کہنا ہے یہیں کہہ دیں"۔ میں ایک بار بھی اس کے ساتھ بالائی منزل پر نہ گئی۔ اس دوران مجھے سکول کے متعلق دوسری دھاندلیوں کا بھی پتہ چلا۔ مثلاً فیس کا سلسلہ یہ تھا کہ تین تین روپے فیس لے کر بچیوں کو ایک روپیہ چھ آنے کی رسید دی جاتی اور بچیوں کو سکول سے نکال دینے کی دھمکی دے کر کہا گیا تھا کہ باہر کسی کو نہ

بتائیں کہ انہوں نے تین روپے فیس دی ہے۔ گرمیوں میں ہر کلاس کے لـ
ایک گھڑا خریدا جاتا تھا اور ایک روپے کے گھڑے کے لئے کلاس کی ہر ایک
بچی سے دو دو آنے وصول کئے جاتے۔ ہر کلاس میں چھت کے دو دو پنکھ
تھے۔ ہر ماہ فیس کے ساتھ چار آنے ہر بچی سے پنکھے کے لئے وصول کئے جا
تھے۔ کبھی کبھی محفل میلاد یا ختم قرآن کے بہانے ہر ایک بچی سے چار آنے وص
کئے جاتے۔ اس رقم میں سے استانیوں کو ضیافت دی جاتی اور بچیوں کو تھو
تھوڑے چنے دے دیئے جاتے۔ بچیوں کو حکم تھا کہ وہ کاپیاں پنسلیں وغ
سکول سے خریدیں۔ کاپی جو بازار سے اس وقت تین آنے میں مل جاتی تھی سک
سے چار آنے کی دی جاتی تھی۔

ان دھاندلیوں کی تفصیلات بڑی طویل اور افسوسناک ہیں۔ آج بھی ا
سکولوں میں یہ دھاندلیاں جاری ہیں۔ غریب ماں باپ کو دن دہاڑے لُوٹا جا
ہے مگر وہ بولتے نہیں۔ احتجاج نہیں کرتے۔ بچیوں کو وہاں سے ہٹا لی
تو کون سے سکول میں داخل کرائیں اور اگر وہ بچیوں کو دس جماعتیں پاس
نہ کرائیں تو ان کے لئے اچھے گھرانوں کے خاوند کس طرح لائیں؛ معاش
ان دھاندلیوں اور تعلیم کے نام پر لُوٹ کھسوٹ کو دیکھ رہا ہے۔ ان سکو
میں ہر صبح بچیاں یہ دعا گایا کرتی ہیں۔ "زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میر
میں نے وہاں شمعوں کو گُل ہوتے دیکھا ہے۔ ایک وہ مشنری سکول ہیں
جہاں مسلمان بچوں کو اسلام سے بے بہرہ کیا جاتا ہے اور ایک یہ اسا
سکول ہیں جہاں مذہب کے نام پر بچوں کو جھوٹ سکھائے جاتے ہیں م
اور ختم قرآن کے نام پر پیسے بٹور کر عیاشی کی جاتی ہے۔

چوہدری نے مجھے پھانسنے کی بہت کوشش کی۔ تنخواہ بڑھانے
لالچ دیتے سو سو کے نوٹ دکھاتے اور ایک روز اس نے مجھے مری کی
کی دعوت دی تو میں اُس پر برس پڑی۔ مُنہ میں جو آیا بک ڈالا۔ مگر وہ ڈھ
آدمی تھا۔ پہلے تو ہنستا رہا پھر اس نے مجھے اغوا کرا دینے کی دھمکی دی۔ م
میں نے پورے مہینے کی تنخواہ وصول کی اور سکول کو ہمیشہ کے لئے خیر با
اور شریفانہ زندگی بسر کرنے کا عزم خواب بن کے تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔

کوٹھی سے فرار

میں نے اُس روز بہت سوچا۔ مکمل سنجیدگی سے سوچا کہ میرا مستقبل کیا ہوگا۔ میں شکست کے بعد تنہائی میں رویا کرتی تھی لیکن اس روز نہیں روئی۔ اپنے متعلق فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ گھر جانے کا ارادہ دل سے بالکل نکال دیا تھا۔ وہاں میرے لئے پھٹکار، اذیّت ناک قید اور حقارت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شریفانہ راستہ اختیار کیا تو راستے میں چٹانیں آگئیں۔ ایک ہی راستہ تھا کہ اُس مینجنگ ڈائریکٹر کے پاس چلی جاؤں۔ وہ جب کبھی مجھے رشوت کے طور پر استعمال کرنا چاہے انکار نہ کروں۔ اُس کی اپنی تفریح کا ذریعہ بنی رہوں اور پیسہ کماؤں۔ شرط یہ پیش کروں کہ میری رہائش کا تسلی بخش انتظام کر دے۔ مجھے اب یہی نظر آنے لگا تھا کہ مجھے کوئی شریف نہیں رہنے دے گا۔ یہ تو آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں کتنی کچھ شریف تھی۔ حرام کا بچہ بھی جن کر عیسائیوں کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن میرا ضمیر جاگ اٹھا تھا اور یہ میرے لئے ایسی مجبوری بن گئی تھی کہ میں بھٹک نہیں سکتی تھی۔ اگر میرے اندر سے روشنی نہ پھوٹتی تو میرے لئے مسئلہ ہی نہیں تھا۔

میں نے رات کو اپنے محسن دوست، جاگیردار کے بیٹے کے سامنے یہ مسئلہ رکھا اور اُسے بتایا کہ اگر ہر ایک مرد ہوس کا رہے تو میرا انجام کیا ہوگا؟ کیا مجھے اپنے ماں باپ کے پاس واپس چلے جانا چاہیئے یا مجھے مہذب طوائف بن جانا چاہیے؛ میں نے اسے اپنے بھائی کی کرتُوت بھی بتائی تھی۔

"اس میں مردوں کا بھی کوئی قصور نہیں"۔ اس نے کہا۔ "تم میں ایسی کشش

ہے کہ جس کسی کے سامنے جاتی ہو وہ بے قابو ہو جاتا ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ مجبور اور بے سہارا عورت اگر بدصورت ہو تو بھی وہ اُس آدمی کو خوبصورت نظر آتی ہے جس کے سامنے وہ مدد کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اس قباحت کا ہمارے ملک میں کوئی علاج نہیں۔"

میں نے اُسے اپنے گھر والوں کے رویّے کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں گھر واپس نہ جاؤں کیونکہ وہاں گھر اور محلے میں اور گرد و پیش کے لوگوں کی نظروں میں میرے لئے ذلّت اور رسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ گھر سے بھاگے مجھے ایک سال ہو گیا تھا۔ اس نے دوسرا مشورہ یہ دیا کہ سوسائٹی میں اچھے لوگ بھی موجود ہیں۔ مزید قسمت آزمائی کرنی چاہیئے بہرحال اُس نے میری حوصلہ افزائی کی تو میں مزید قسمت آزمائی کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے اُسے پہلی بار یہ کہا کہ اپنے کسی دوست کے ساتھ میری شادی کرا دے۔ اُس نے بالکل صاف اور واضح جواب دیا۔ اس نے کہا "میں اپنے کسی دوست کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ تمہارے متعلق ساری باتیں بتانی پڑیں گی جو سُن کر وہ شادی کے لئے رضامند نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے کسی بھی دوست کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں کرے گا۔ شادی کا بہتر حل یہ ہے کہ کہیں ملازمت کر لو اور اپنے لئے کوئی خاوند ڈھونڈ لو۔ چند دن اس کے ساتھ گھومو پھرو۔ اُس کی نیّت اور ذہنیت کا اچھی طرح جائزہ لو اگر اچھا لگے تو شادی کر لو۔"

میرے اس خدشے کے متعلق کہ گھر کا کوئی آدمی مجھے دیکھ لے گا تو گھر لے جائے گا، اُس نے کہا "تم بالغ ہو۔ ایسی صورت پیدا ہو گئی تو میں تمہارے ساتھ کورٹ میں چلا جاؤں گا۔ تم حلفی بیان دینا کہ تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔" مجھے اپنی اس قانونی پوزیشن کا علم نہیں تھا۔ اس کی وضاحت سے میرے دل سے یہ خدشہ نکل گیا کہ گھر والے مجھے زبردستی گھر لے جائیں گے۔

چند دنوں بعد ان لڑکوں نے ایک پاکستانی پرائیویٹ کمپنی کا پتہ دیا۔ میں وہاں چلی گئی۔ کمپنی کے مالک سے ملی۔ اس نے کہا "میرے پاس چار لڑکیاں ہیں۔

پانچویں کی جگہ نہیں ہے۔" میں نے یہ جھوٹ بول کر اس کی منّت کی کہ میرا باپ مر گیا ہے۔ بہن بھائی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ کوئی جوان بھائی نہیں۔ کنبے کو فاقوں سے بچانے کی نازک ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ میرے آنسو بھی نکل آئے۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا "مجھے ذرا سوچ کر فیصلہ کرنے کا موقع دیں۔ دیکھیں کہ یہاں میں بہت مصروف ہوں۔ رات ساڑھے آٹھ بجے میرے گھر آ جائیں تو تفصیل سے بات کر سکوں گا۔" اس نے اپنی کوٹھی کا پتہ بتا دیا اور یہ بھی کہا۔ "اگر آپ پسند کریں تو رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔"

میں رات کو اس کی کوٹھی میں چلی گئی۔ معلوم ہُوا کہ گھر میں وہ اکیلا ہے۔ اس کے بیوی بچے سوات گئے ہوئے تھے۔ اس کی عمر چالیس سال سے خاصی کم تھی۔ باتوں میں ہمدردی اور شگفتگی تھی۔ اس نے شاہانہ کھانا کھلایا۔ اس دوران وہ مجھ سے ذاتی باتیں پوچھتا رہا۔ والد صاحب کی وفات اور چھوٹے بہن بھائیوں کے متعلق بھی اس نے پوچھا مگر گھر کا پتہ پوچھا تو میں نے بتانے سے انکار کر دیا۔ وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا "میں آپ سے ایک بات کہوں گا اور آپ سے امید رکھوں گا کہ آپ گھبرا نہ جائیں اور یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کو دھوکہ دوں گا . . ." میں چپ رہی۔ اُس وقت ہم کھانا کھا چکے تھے اور ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ میں مردوں کی ذہنیت سے واقف تھی مگر اس کی باتوں میں خلوص کی جھلک دیکھ کر میری کمزوریاں اور میری بے بسی مجھ پر غالب آ گئی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔

اُس نے مسکرا کر ایسی بات پوچھی کہ میرے سامنے کمرہ گھوم گیا۔ اُس نے کہا "بچّہ ضائع کرا دیا تھا یا شادی کر لی تھی؟" میرے چہرے کا رنگ یقیناً بدل گیا ہو گا جسے دیکھ کر اس نے میری ٹھوڑی تھام کر کہا۔ "میں نے تمہیں طعنہ نہیں دیا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں اُس ہوٹل میں کبھی کبھی جایا کرتا تھا۔ ذرا دل بہلانے کا بہانہ تھا۔ تمہیں وہاں دیکھا تھا اور تمہارے متعلق تمہارے ہی ایک دوست سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ تم خاصی مہنگی لڑکی ہو لیکن اب تمہارا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تمہیں ڈھونڈتا رہا مگر تم مل نہ سکیں۔ آج تم اچانک میرے سامنے آ گئیں تو میں نے ٹال مٹول کر کے تمہیں گھر بلانا

مناسب سمجھا۔"

"یہاں بلانا کیوں مناسب سمجھا؟" میں نے پوچھا۔

"تم گھبراؤ نہیں" اس نے کہا۔ "تمہیں اپنے دفتر میں بڑی اچھی جگہ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہاں گپ شپ لگانے کو بلایا تھا۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔ "یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ باپ مرگیا ہے۔ بہن بھائی چھوٹے ہیں؟"

وہ چونکہ مجھے اور میرے ماضی کو جانتا تھا، اس لئے میں نے اپنے آپ کو چھپانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اسے بتایا کہ بچہ ضائع کروا دیا تھا، اور اب باعزت زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اُسے یہ نہیں بتایا کہ کہاں رہتی ہوں۔ میں نے جب اُسے یہ بتایا کہ میں نے شادی نہیں کی تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "تم شادی کر کے کیا کرو گی۔ کچھ عرصہ اور سیر سپاٹا کر لو۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایک سال ہوا میں سیر سپاٹا چھوڑ چکی ہوں۔ اُس نے بظاہر تسلیم کرلیا کہ میں گناہوں کی دنیا سے نکل آئی ہوں لیکن وہ مجھے گناہ پر آمادہ کرنے لگا۔ اُس نے ایسے مکالمے بولے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری محبت میں تڑپتا رہا ہے اور میری تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا ہے۔ وہ جس پیار بھرے طریقے سے مجھے گناہ پر اُکسا رہا تھا میں اسی پیار سے اسے ٹال رہی تھی اور اس کی منت کر رہی تھی کہ وہ میری قسم نہ توڑے مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کنواری اور شریف لڑکی نہیں ہوں۔ اس نے مجھے پانچ سو روپے ماہوار کی ملازمت پیش کی۔

اُس نے زبردستی نہیں کی۔ دست درازی کی نہیں۔ اُس نے جیب سے سَو سَو روپے کے نوٹ نکالے اور دس نوٹ گن کر میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ کر اپنے ساتھ لگالیا اور میرے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ میں نے مزاحمت نہ کی۔ وہ بش شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "آپ کپڑے بدل لیں۔ بیڈ روم میں چلتے ہیں۔" مرد پر جب جنس کا بھوت سوار ہوتا ہے تو عورت کے ہاتھ میں اس کی حیثیت کھلونے کی سی ہوتی ہے۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور بولا۔ "دو منٹ میں کپڑے بدل کے آتا ہوں۔"

اور ان دو منٹوں میں میں ڈرائنگ روم سے نکلی اور بہت تیز چلتی کوٹھی کے بڑے گیٹ سے بھی نکل گئی۔ زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ کوٹھی سے کار باہر نکلی اور رک گئی۔ وہ میرے تعاقب میں نکلا تھا۔ میں اس کی کوٹھی کے پچھلی طرف چلی گئی۔ کار چلنے کی آواز سنائی دی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ دوسری طرف نکل گئی ہے۔ میں ایک ہزار روپیہ اس کے صوفے پر رکھ آئی تھی۔ کوئی رکشا، ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت تھی اور لوگ بھی آجا رہے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ اس نے دیکھ لیا تو کوئی الزام عائد کر کے مجھے بے عزت کر دے گا۔ خدا نے کرم کیا کہ ٹیکسی مل گئی اور مجھے بچا لے گئی۔

پھر دروازے بند ہو گئے

یہ میری ایک اور شکست تھی۔ میرا ماضی میرے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ میرے دل میں یہ وہم گھر کرنے لگا کہ میرے گناہ آسیب کی طرح میرے مستقبل پر سوار رہیں گے اور میری قسمت میں گناہ آلود زندگی لکھ دی گئی ہے۔ میں نے اس رات آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ میں نے اپنا منہ نوچ لینا چاہا۔ دل میں یہ بھیانک ارادہ بھی آیا کہ اپنے چہرے پر تیزاب پھینک لوں یا اسے آگ سے تھوڑا جلا کر بھدا کر دوں مگر سوچا کہ بدصورت چہرے کو نوکری بھی نہیں ملے گی اور خاوند بھی نہیں ملے گا.... یہ میری ذہنی کیفیت تھی۔ کون اپنا مُنہ نوچتا ہے اور کون اپنا چہرہ جلاتا ہے۔ غصہ آتا تھا اور میں اپنا ہی خون پی لیا کرتی تھی۔

اس عرصے میں کتنی بار اُس سکول اور کالج کے سامنے سے گزری جہاں میں تعلیم حاصل کرنے گئی تھی مگر گناہوں کی گٹھڑی ضمیر پر لاد کر گھر سے بے گھر ہو گئی۔ میں نے اس سکول اور کالج کے سامنے اور کئی سکولوں اور کالجوں کے سامنے کاروں، سکوٹروں اور موٹر سائیکلوں کا ہجوم دیکھا۔ ان میں وہی شکاری دیکھے جن کا میں شکار ہوتی تھی۔ یہ رونق پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ پاکستان مکمل طور پر "آزاد" ہو گیا تھا۔ جی میں آتی تھی کہ وہاں رک جاؤں اور لڑکیوں سے چیخ چیخ کر کہوں کہ ان کاروں سے دُور رہو، ان شہزادوں کی مسکراہٹوں سے دُور رہو، اس تہذیب کی چمک سے دُور رہو، مجھے دیکھو، میرا عبرتناک انجام دیکھو۔ میری بے چین نگاہیں اور میری چُپ چاپ چیخیں کسی لڑکی کو نہیں روک سکیں۔ میں انہیں کاروں میں لفٹ لیتے دیکھتی رہی۔ میں نے شام کے وقت اپنے قریب سے گزرتی کاروں میں لڑکیوں

کے قہقہے بھی سنے مگر میں دیکھتی رہی اور سنتی رہی۔

اس کوٹھی سے فرار ہوتی تو میں پانچ چھ دن سوچتی رہی کہ کیا کروں۔ اب تو میری ایک سوچ ذہن پر غالب آتی تھی کہ اپنے آپ کو بیچ دوں۔ میری حیثیت طوفان میں تنکے کی اور آندھی میں دیئے کی سی ہو گئی تھی۔ اب میں اس کوٹھی میں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر حد ہوتی ہے۔ ایک سال اور چار مہینے گزر گئے تھے۔ مجھے یہ شک بھی ہونے لگا تھا جیسے یہ لڑکے مجھ سے اکتانے لگے ہیں۔ مجھے اب بہت جلدی ٹھکانہ کرنا تھا۔ کسی کو پھانس کر شادی کر لیتی یا خودکشی کر کے ہمیشہ کے لئے اس جہنم سے آزاد ہو جاتی۔

پھر دوائیاں بنانے والی ایک غیر ملکی کمپنی کے دفتر میں گئی۔ اس کا منیجر پاکستانی تھا۔ اس کے ساتھ وہی تجربہ ہوا جو پہلے تین دفعہ ہو چکا تھا۔ میرے سینے میں جو غبار بھرا ہوا تھا، وہ میں اس پر نکال کر وہاں سے نکل آئی۔ وہاں میں نے سولہ دن نوکری کی۔ دو جوان لڑکیاں اور ایک ادھیڑ عمر عورت وہاں ملازم تھی۔ تینوں واجبی سی شکل وصورت کی تھیں۔ منیجر مجھ پر بہت ہی مہربان ہو گیا۔ میرا کام کچھ اور تھا لیکن بار بار مجھے اپنے دفتر میں بلاتا، بٹھا لیتا اور ہمدردی کا اظہار کرنے لگتا۔ میں نے بے تکلفی سے گریز کیا۔ وہ آخر انہی باتوں پر آ گیا جو میرے لئے نئی نہیں تھیں۔ اس نے جب میری خوبصورتی کی تعریف کی تو میں نے کہا۔

"کوئی نئی بات سنائیں۔ یہ تو بڑی پرانی خبر ہے۔" پھر میں نے اسے یہ بھی کہا۔ "جی ہاں۔ میں جانتی ہوں کہ میں بہت حسین ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آئینے میں آپ کبھی اپنی صورت بھی دیکھ لیں۔ آپ جتنے باہر سے کالے ہیں، اس سے زیادہ اندر سے کالے ہیں۔"

میں بھری بیٹھی تھی۔ منہ میں جو آیا بک ڈالا اور اتنی زور سے میں نے بکواس شروع کر دی کہ اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور التجا کی۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ باہر سارا دفتر سن رہا ہوگا۔" میں نے بڑی مشکل سے اس کی جان بخشی کی اور اس سے سولہ دنوں تک کی تنخواہ مانگی۔ اس نے بہت منتیں کیں کہ میں نوکری نہ چھوڑوں لیکن میں نے تنخواہ لے لی اور دفتر جانا چھوڑ دیا۔

اتنے تجربوں کے بعد مجھے نوکری کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے تھا لیکن لیکن قسمت میں ابھی اور ذلت اور رسوائی لکھی تھی۔ بند ہونے کے لئے آخری دروازہ رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو یہ بھی دیکھ لو۔ یہ ایک اور غیر ملکی کمپنی تھی۔ اخبار میں اشتہار دیکھا کہ وہاں دو تین لڑکیوں کی ضرورت ہے۔ میں چلی گئی۔

پندرہ سولہ لڑکیاں انٹرویو کے لئے آئی تھیں۔ صرف میں برقعے میں تھی، باقی سب جدید فیشن کا نمونہ تھیں۔ غیر ملکی کمپنی کی ملازمت کے لئے غیر ملکی بہروپ دھار کر آئی تھیں۔ انٹرویو شروع ہوا۔ میں اندر گئی تو انٹرویو لینے والے نے کہا۔ "آپ کو برقعہ اتارنا پڑے گا۔"

"اتار دوں گی۔" میں نے کہا۔

اس نے چند ایک اِدھر اُدھر کے سوال پوچھے۔ پھر انگریزی میں باتیں کیں۔ انگریزی بولنے کی مجھے خوب مہارت تھی۔ وہ میری بول چال سے متاثر ہوا۔ وہ اس کمپنی کے منیجر کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا۔ جوان آدمی تھا عمر تیس سال لگتی تھی۔ منیجر اٹلی کا باشندہ تھا اور یہ سیکرٹری پاکستانی۔ میرا کام ایسا تھا کہ مجھے دفتر میں زیادہ تر وقت اسی کے ساتھ گزارنا تھا۔ یہ آدمی بات چیت کے سلیقے اور شائستگی کی وجہ سے مجھے اچھا لگا۔ اس کی باتوں میں لطیف سی شگفتگی اور انداز میں متانت تھی۔ اس نے میرے ساتھ کوئی غیر ضروری اور غیر متعلق بات نہ کی۔ مجھے باہر انتظار کرنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد مجھے منیجر کے پاس لے گیا۔ دوسری امیدوار لڑکیوں کو اس نے واپس بھیج دیا تھا۔ اٹلی کے منیجر نے میرے ساتھ چند ایک باتیں کیں اور مجھے ملازم رکھنے کی منظوری دے دی۔ تنخواہ ساڑھے چار سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ دو تین الاؤنس ملا کر سوا پانچ سو ہو جاتی تھی۔

میری حالت اب شکستہ کشتی کی سی تھی یا اُس ڈوبتے ہوئے انسان کی جو تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا ہو۔ اس پاکستانی سیکرٹری کی باتوں میں اُنس بھی تھا اور درد بھی۔ میں نے اس میں بدنیتی کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں دیکھی۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی غم یا دُکھ ہے جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہی میری کمزوری تھی۔ اس نے مجھے کام سکھانا شروع

کر دیا اور پورے خلوص سے میری راہنمائی کی۔ اس کا خلوص اور اپنائیت دیکھ کر میرا اپنا جی چاہتا تھا کہ اس کے دل کی باتیں سنوں اور اسے اپنے دل کی باتیں سناؤں۔ دفتر میں میرا غالباً پندرھواں دن تھا جب میں نے اس سے پوچھا "آپ کے دل میں کیا ہے جو مجھے آپ کے چہرے پر نظر آتا ہے مگر آپ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

"میں یقیناً چھپانے کی کوشش کر رہا ہوں" اس نے کہا۔ "مرد کو زیب نہیں دیتا کہ عورت کے سامنے اپنا رونا رونے بیٹھ جائے۔ میری آپ کیا مدد کر سکتی ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ مجھے خودکشی کر لینی چاہیے۔"

میں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے دل کا روگ ضرور بتائے۔ اس نے کہا "مجھے آپ کی عمر کی ایک لڑکی نے ڈس لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ کی عمر اور آپ جیسی خوبصورت لڑکیوں سے نفرت ہو گئی ہے۔"

اس شخص سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی جسے میری عمر اور شکل کی لڑکیوں سے نفرت تھی۔ یہ آدمی میرے لئے عجوبہ تھا کیونکہ میں نے اُس وقت تک جتنے آدمی دیکھے تھے وہ کسی برائے نام لڑکی کو دیکھ لیں تو کارٹونوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے تھے مگر یہ آدمی مجھ جیسی شکل و صورت کی لڑکیوں سے نفرت کرتا تھا۔ دفتر میں تفصیلی باتیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے کہا کہ چار بجے کے بعد میں اس کے ساتھ ہوٹل میں یا باغ میں چلوں۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ ہم نے ایک یورپی ہوٹل میں چائے پی۔ پھر ٹہلتے ٹہلتے باغ میں چلے گئے۔ میں آزاد تھی۔ ساری رات باہر رہتی تو بھی باز پرس کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ میں برقعے میں تھی۔ اس نے اپنا جو حادثہ سنایا وہ مختصراً یوں ہے کہ چار سال گزرے مجھ جیسی ایک بے سہارا لڑکی اس کے پاس ملازمت کے لئے آئی۔ وہ خوب صورت لڑکی تھی۔ اُس کے گھر میں اتنی غربت تھی کہ لڑکی ملازمت کے لئے مجبور ہو گئی تھی۔ اس سیکرٹری نے اسی غیر ملکی منیجر سے منظوری لے کر اُسے دفتر میں جگہ دے دی۔ اُس کے کہنے کے مطابق لڑکی ملازمت کے قابل نہیں تھی۔ اس نے دسویں جماعت سے سکول جانا چھوڑ دیا تھا۔

یہ سیکرٹری اس لڑکی میں اس طرح دلچسپی لینے لگا کہ اسے انگریزی بول چال سکھانے لگا اور دفتر کے کام کی ٹریننگ بھی دینے لگا تاکہ اس کی نااہلی سے پردہ نہ اُٹھے۔ لڑکی جوان تھی۔ سیکرٹری بھی جوان تھا۔ یہ دلچسپی محبت میں بدل گئی۔ شادی کے وعدے ہو گئے۔ لڑکی غریب گھرانے کی تھی۔ اس کے والدین نے بصد شکر یہ لڑکی کا رشتہ اس آدمی کو دے دیا مگر مشکل اس آدمی کے لئے پیدا ہو گئی۔ وہ امیر ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اس کی شادی وہ اپنی سطح کے خاندان میں کرانا چاہتے تھے۔ اس نے وہاں انکار کر دیا۔ اس کے ماں باپ ناراض ہو گئے۔ وہ ایک اور شہر میں رہتے تھے۔ اس سیکرٹری نے ان کی اجازت کے بغیر اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ ماں باپ نے اسے جائیداد وغیرہ سے محروم کر دیا۔ اس نے غربت کی ماری ہوئی لڑکی کو چھوٹی سی کوٹھی میں لا بسایا اور اسے بیگم بنا دیا۔ وہ دفتر میں ملازمت بھی کرتی رہی۔ خاوند نے اسے انگریزی میں اتنا ماہر بنا دیا کہ وہ مادری زبان کی طرح انگریزی بولنے لگی۔ پھر وہ اس لڑکی کو اونچے درجے کے ہوٹلوں اور اونچے درجے کی سوسائٹی میں گھمانے پھرانے لگا۔

اس کے کہنے کے مطابق لڑکی کی اصلیت کچھ اور تھی۔ اُس کا دماغ خراب ہو گیا۔ وہ ضرورت سے زیادہ آزاد ہو گئی اور آزادانہ دوستیاں لگانے لگی۔ اس میں خاوند کا قصور بھی تھا۔ اسی نے اُسے اس دنیا سے روشناس کرایا تھا جہاں شرم و حجاب کو بدتہذیبی سمجھا جاتا تھا۔ اس سیکرٹری کے پاس کار نہیں تھی۔ لڑکی کار کی سواری پر مرمٹی اور شادی کے دوسرے سال کے آخر میں اتنی آزاد ہو گئی کہ خاوند کو بتائے بغیر گھر سے چلی جاتی اور دوستوں کے ساتھ عیش و عشرت کرتی رہتی۔ خاوند نے اسے روکا تو اس نے یہ بھول کر کہ اس شخص نے اسے غربت سے نکالا ہے، خاوند کو ٹکا سا جواب دے دیا کہ وہ گھر کی قیدی بن کر نہیں رہ سکتی۔ وہ اس نیکی کو جو اس خاوند نے اُس کے ساتھ کی تھی اور اس کی محبت کو اور اس کے اس ایثار کو کہ اس نے اپنے والدین کو ناراض کیا اور جائیداد سے محروم ہوا، فراموش کر کے آزاد ہو گئی۔

خاوند نے محبت کی خاطر برداشت کیا اور اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک روز اس لڑکی نے اسے بے حیائی سے کہا کر وہ طلاق لینا چاہتی ہے۔ خاوند نے اسے طلاق دے دی۔ ایک بہت ہی امیر آدمی نے لڑکی سے شادی کا وعدہ کیا تھا جو اس آدمی نے پورا نہ کیا۔ چند دن عیش کر کے اسے دھتکار دیا۔ اسے خاوند نے سوسائٹی گرل یعنی مہذب طوائف کے روپ میں کئی بار دیکھا۔ یہ ایسی چوٹ تھی جس نے اس جواں سال آدمی کو جذباتی لحاظ سے مُردہ کر دیا۔ یہ تھی اس کی داستان غم جو میں نے اختصار سے سنا دی ہے۔ اس نے کم و بیش دو گھنٹوں میں یہ کہانی ختم کی تھی۔ وہ اب اس کوٹھی میں اکیلا رہتا تھا۔ مجھے قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ اسے اپنا آپ پیش کر دوں اور کہوں کہ میرے ساتھ شادی کر لو لیکن فوراً ہی یہ کہہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ یہ آدمی مجھے پہلے روز ہی اچھا لگا تھا۔ اب اس کی بپتا سنی تو میرے دل میں اس کے لئے درد اور پیار پیدا ہو گیا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اسے شادی کی پیش کش کروں گی اس میں میرا فائدہ بھی تھا بلکہ میرے مسئلے کا حل ہی یہی تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اس شخص سے اُنس پیدا ہو گیا تھا اور میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ ہر لڑکی بے وفا نہیں ہوتی۔

اُس روز کے بعد میں نے اُسے اپنے قریب کرنا شروع کر دیا۔ دوسری تیسری شام ہم ہوٹل میں چلے جاتے چائے پیتے اور باغ میں جا بیٹھتے۔ میں اس کی باتیں سنتی اور پوری دلچسپی کا اظہار کرتی۔ ایک شام اُس نے بے ساختہ کہا۔ "تم نے میرے دل کا غبار ہلکا کر دیا ہے۔ اب یہ امید بندھ گئی ہے کہ میں زندہ رہ سکوں گا۔ تمہارے سوا میں نے یہ روگ کسی کو نہیں سنایا تھا۔" اتنی بے تکلفی کے باوجود اس نے میرے جسم کو چھوا تک نہیں اور ایسی کوئی بات بھی نہ کی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مجھے اُس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے دوسروں نے مجھے دیکھا تھا۔ ہم شام کے بعد بھی اندھیرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ پھر بھی اُس نے جیسے یہ کبھی محسوس ہی نہ کیا ہو کہ اس کے ساتھ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی ہے اور یہ لڑکی اسے چاہتی ہے۔

میرا رویہ دیکھ کر اس نے میرے ذاتی مسائل میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور مجھ سے پوچھا۔ "تم میں یہ تضاد کیوں ہے؟ برقعے کے بغیر تم باہر نہیں نکلتی۔ تمہاری انگریزی بول چال بتاتی ہے کہ تم بہت عرصہ انگلینڈ میں رہی ہو اور تمہیں شام کے بعد گھر جانے کی بھی جلدی نہیں ہوتی۔ تم انداز، چال ڈھال اور بول چال سے بالکل آزاد لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ مجھے اپنے متعلق کچھ بتاؤ۔ تم نوکری کسی مجبوری کے تحت کر رہی ہو یا شوقیہ؟"

"مجبوری کے تحت۔" میں نے جواب دیا۔ "برقعہ بھی مجبوری کے تحت پہنتی ہوں۔" اور میں نے یہیں یہ بات گول کر دی۔ اُس نے مجھے ہم راز اور ہمدرد بنا لیا تھا۔ میں اسے اپنی حقیقت بتانے لگی تھی لیکن یہ خیال آگیا کہ اس سے پہلے میں نے جسے بھی اپنی اصلیت بتائی ہے، اُس نے بیسوا سمجھ کر مجھے ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں اسے کچھ دن اور دیکھنا چاہتی تھی۔ مجھے بہرحال یقین ہو چلا تھا کہ یہی ہے وہ مخلص انسان جس کی مجھے ضرورت ہے۔ پھر بھی میں دُودھ کی جلی ہوئی چھاچھ کو بھی پھونکیں مار رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔ "کسی روز آپ کو سناؤں گی کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔"

مری کی ایک رات اور شراب

اُس نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے ٹال دیا۔ اُس روز کے بعد میں یہ سوچنے لگی کہ اسے کب اور کس طرح کہوں کہ مجھے اپنے پاس رکھ لے اور میرے ساتھ شادی کر لے۔ ایک موقع اس نے خود ہی پیدا کر دیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اُس وقت تک ہم ایک دوسرے کے غمخوار بن چکے تھے۔ پھر بھی اُس نے کوئی ایسا اشارہ نہ دیا جس سے میں جان سکتی کہ اس کی نیت کیا ہے۔ میرے دل میں اس کا احترام اور پیار گہرائی تک اتر چکا تھا۔ ایک روز اُس نے کہا۔ ”دل اچاٹ سا ہوتا جا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ دن مری گزار آؤں۔“ ذرا توقف سے اُس نے کہا۔ ”تم تو نہیں چل سکو گی۔ سوچتا ہوں، تمہارے بغیر مری جا کر بھی کیا فرق پڑے گا۔ تنہائی اور گھٹن مجھے مار ڈالے گی ... چل سکو گی؟“

”چلی چلوں گی۔“

”گھر والوں کو کیا بتاؤ گی؟“

”کوئی اُلٹا سیدھا جھوٹ بولوں گی۔“ میں نے کہا اور اس سے پوچھا۔ ”مجھے چھٹی دلا سکیں گے آپ؟“

”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”دس روز کافی ہوں گے لیکن دفتر میں کسی سے ذکر تک نہ کرنا کہ تم میرے ساتھ مری جا رہی ہو۔“

دوسرے ہی دن اُس نے دس روز کی چھٹی لے لی اور مجھے اس بہانے سے چھٹی لے دی کہ میری ماں بڑی سخت بیمار ہے۔ اگلی شام ہم مری میں تھے۔ ہم نے ایک اعلیٰ ہوٹل میں قیام کیا۔ ہوٹل کا مینجر اس کا دوست معلوم

ہوتا تھا۔ اس نے میرے ساتھی کا استقبال تپاک سے کیا اور ہمیں ایک الگ تھلگ کمرہ دیا۔ میں نے کھڑکی کھولی تو یوں لگا جیسے میرے سامنے جنّت کے دروازے کھل گئے ہوں۔ میں نے مری کی باتیں سُنی تھیں۔ کبھی گئی نہیں تھی۔ ہوٹل بلندی پر تھا اور ہمارا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ کھڑکی سے مجھے قدرت کا حُسن دکھائی دیا۔ دُور کشمیر کے برف پوش پہاڑ تھے۔ ہر سُو ہریالی تھی۔ دُور نیچے سے دُور اوپر تک لمبے لمبے پیڑوں نے زمین کے اس خطّے کو خوابوں کا دیس بنا رکھا تھا۔ بادلوں کے سپید سپید اور بڑے بڑے گالے وادیوں میں اُڑ رہے تھے۔ بعض اوقات یہ بادل زیادہ ہو جاتے تو ایسے لگتا جیسے میں زمین پر نہیں، فضا میں ہوں اور جب بادل کا ایک ٹکرا میری کھڑکی کے قریب سے گزرا تو اس میں کوئی شک نہ رہا کہ میں فضا میں ہوں اور کوئی غیبی ہاتھ بڑے پیار سے میری رو گی روح کو سہلا رہا ہے۔ مجھ پر خود فراموشی سی طاری ہو گئی۔

میں نے اُس کے ہاتھ کا لمس اپنے دائیں کندھے اور گردن پر محسوس کیا جو میری روح کو سہلا رہا تھا۔ میں مدہوشی سے بیدار ہو گئی۔ سیکرٹری اس طرح میرے ساتھ کھڑا تھا کہ اس کا دایاں ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ میرا بایاں کندھا اس کے سینے پر لگا ہُوا تھا اور اُس کا مُنہ میرے سر کے ساتھ تھا۔ جذباتی طور پر تو میں اس کے قریب ہو ہی گئی تھی جسمانی طور پر وہ پہلی بار میرے اتنے قریب آیا تھا۔ میں نے اس کے اور قریب ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ تھی۔ اُس کا جو ہاتھ میرے کندھے پر تھا، سرک کر میری ٹھوڑی کے نیچے آ گیا۔ اُس نے میرا مُنہ اُوپر اُٹھایا اور پھر میں نے اس کا مُنہ نہایت آہستہ آہستہ آگے بڑھتا دیکھا۔ کھڑکی کے پردے گر پڑے اور دہی پردہ اُٹھا جس سے میں ناآشنا نہیں تھی مگر فرق تھا۔ بہت بڑا فرق تھا۔ اس سے پہلے میں نے کسی مرد کے ہونٹوں میں اس قسم کا کیف محسوس نہیں کیا تھا۔ اس مرد کے ہونٹوں میں پُرکیف پیغام تھا۔ میری نجات کا سندیسہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میرے ہونٹوں نے نہیں بلکہ میری شکست خوردہ اور مجروح روح

نے اس کے ہونٹوں کی آغوش میں پناہ لے لی ہو۔ یہ مرد بدکار اور بدطینت نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ جیسی خوبصورت اور جوان لڑکی کا ڈسا ہوا ہے۔ میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ وفا کیا ہوتی ہے۔ میں نے اسے بتایا نہیں تھا کہ اسے تو ایک لڑکی نے ڈنک مارا ہے لیکن میں بہت سے مردوں کی ڈسی ہوتی ہوں اور پناہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔

میں اس کے بازوؤں کے گھیرے میں، اس کے گال سے اپنا رخسار لگائے مدہوش ہو چکی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا۔ "میں شاید وہی غلطی کر رہا ہوں جو مجھے ایک بار خودکُشی تک پہنچا چکی ہے۔"

میں نے اسے یقین دلانے کی ذرّہ بھر کوشش نہیں کی کہ میں بے وفائی نہیں کروں گی۔ جذبات نے مجھے بادلوں کے اُن ٹکڑوں میں پہنچا دیا تھا جو میں نے مری کی وادیوں میں تیرتے دیکھے تھے۔ میں اس طلسم سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ میری پہلی محبت تھی۔ اس سے پہلے تو میں آوارگی اور مغربی تعیّش کی عادی تھی۔ میں شاید کچھ کہنے لگی تھی کہ بیرا چائے لے کے آ گیا اور طلسم ٹوٹ گیا۔ چائے کے دوران میں نے اُسے کہا کہ وہ اُس لڑکی کو بھول جائے۔ ہر لڑکی آوارہ اور بے وفا نہیں ہوتی۔ کم از کم میں ایسی نہیں ہوں۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا.... چائے کے بعد ہم باہر نکل گئے۔ میں نے برقعہ چڑھا لیا تھا کہ کوئی پہچان نہ لے۔ ٹھوڑی اور ناک کو نقاب میں چھپا لیا۔ آنکھیں اور پیشانی ننگی رکھی۔

مری کی مال روڈ نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ روشنیوں سے مال روڈ پر دن کی روشنی کا گمان ہوتا تھا۔ انگریزی تعلیم، مغربی تہذیب اور یورپی ہوٹلوں نے مجھے امریکی لڑکی بنا دیا تھا مگر مری کی مال پر جب اپنے ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اس پاکستان کا حصّہ ہے جسے اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ ایسی عریانی اور ایسی نمائش؟ مجھ جیسی بے حجاب لڑکی بھی حیران ہو گئی۔ مرد تماشائی تھے اور لڑکیاں اتنی بے حیائی سے تماشہ بنی ہوتی تھیں کہ یورپ بھی دیکھ کر شرما جائے۔ میں نے بعض نوجوان جوڑوں کو ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے اس ہجوم میں ٹہلتے دیکھا، لیکن بے حیائی

لڑکیوں میں ہی نہیں تھی، میں نے پچاس سے ساٹھ سال تک کی بوڑھی عورتوں کو گہرے میک اپ میں دیکھا۔ اُن دنوں تنگ پائنچوں کا رواج تھا۔ ان بوڑھی عورتوں کی شلواروں کے پائنچے لڑکیوں سے زیادہ تنگ تھے۔ بعض بوڑھی عورتوں کو میں نے بغیر آستینوں کی قمیض پہنے ہوئے بھی دیکھا۔

میں نے جب ماؤں اور دادیوں کو بوڑھے بالوں اور داد دن کے ساتھ اس حال میں دیکھا تو میں نے اپنے دوست سے کہا۔ "اب ان نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا سنبھلنا ناممکن ہے۔" اس نے بتایا کہ بعض بوڑھی عورتوں کے ساتھ جو نوجوان لڑکیاں ہیں، یہ ان کی بیٹیاں ہیں جنہیں وہ نمائش کے لئے ساتھ لاتی ہیں۔ ان کے لئے وہ دولہے پھانسنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس نے کہا۔ "مری کی مال منڈی ہے۔ یہاں سے ایک رات کے لئے بھی دلہن مل سکتی ہے اور ساری عمر کے لئے بھی۔"

میں مکمل طور پر بے حیا ہو گئی تھی جسے انگریزی میں ایڈوانس اور ماڈرن کہتے ہیں لیکن مری میں لڑکیوں کو دیکھ کر میں اپنے آپ کو پسماندہ سمجھنے لگی۔

میں نے اس ہجوم میں دو جانے پہچانے چہرے بھی دیکھے۔ یہ میرے یا میرے یورپ زدہ جسم کے دوست رہ چکے تھے۔ میری جگہ اب ایک اور لڑکی ان کے ساتھ تھی۔ اچانک میرے اندر اُبال سا اُٹھا۔ طبیعت بے چین ہو گئی۔ میں اس لڑکی کو روک نہیں سکتی تھی۔ وہ جن دو شہزادوں کے ساتھ مری آئی تھی ان کے منہ نہیں نوچ سکتی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "اس ہجوم سے نکلو۔ واپس ہوٹل میں چلو یا کسی ایسے گوشے میں چلو جہاں اور کوئی نہ ہو۔"

ہم واپس ہوٹل میں چلے گئے۔ اُس رات ہم نے بہت باتیں کیں۔ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے رہے۔ سینے کے غبار ہلکے کرتے رہے مگر میں نے اُسے اپنے ماضی کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ البتہ اسے شادی کے لئے رضامند کر لیا۔ وہ دراصل پوری طرح رضامند نہیں ہوا تھا۔ تاہم میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ ہم الگ الگ پلنگوں پر سوتے۔ وہ جلدی سو گیا۔ میری نیند اُڑ گئی۔ اس سوچ نے مجھے بے حال کر دیا کہ اسے اپنا ماضی دکھا دوں یا سینے میں چھپاتے

رکھوں۔ ڈر یہ تھا کہ وہ مجھے "چلی ہوئی" لڑکی سمجھ کر ٹھکرا دے گا مگر یہ ڈر بھی تھا کہ شادی کے بعد جب میں اس کے ساتھ برقعے کے بغیر گھوما پھرا کروں گی تو مجھے دیکھ کر مجھے جاننے والوں میں سے کوئی اسے بتا دے گا کہ میں کیا ہوں۔ دونوں خوف بے معنی نہیں تھے۔ لہٰذا میرے لئے فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

دوسرے دن وہ مجھے باہر لے گیا۔ بازار سے اُس نے میرے لئے ایک انگوٹھی خریدی اور مجھے اُس طرف نیچے لے گیا جہاں پکنک سپاٹس ہیں۔ ہم دُور نیچے اُتر گئے۔ ایک تنہا اور ڈھکے چھپے گوشے میں بیٹھ کر اس نے مجھے اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گا، اور اس نے انگوٹھی میری انگلی میں ڈال دی۔ یہ ہماری منگنی تھی۔ مجھے ہچکی سی آئی اور میں بے قابو ہو کر رونے لگی۔ مجھے خیال آ گیا تھا کہ میرے گھر میں سرحد پار والی شرافت باقی رہتی تو مجھے آج سہیلیاں دلہن بناتیں اور رات رات مجھے نرغے میں لے کر ڈھولک پر گیت گاتیں، میں لجاتی شرماتی ہوئی ڈولی میں بیٹھتی، میرے ماں باپ خوش ہوتے کہ وہ ایک مقدس فرض سے فارغ ہوئے مگر میری قسمت میں مجرمانہ شادیاں لکھی تھیں۔ پہلی شادی کی تو بھی میں مجرم تھی۔ اب دوسری شادی ہو رہی تھی تو بھی میں مجرم تھی۔ اُس نے مجھے بہلا لیا لیکن رونے کی وجہ نہ پوچھی۔

"ہم نے منگنی تو کر لی ہے۔" اس نے کہا۔ "تمہارے والدین نہ مانے تو کیا ہو گا؟"

"نہ مانیں۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کے پاس آ جاؤں گی اور شادی کر لیں گے۔ یہ کوئی ایسا ٹیڑھا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے متعلق بات بھی کی جائے۔"

"آج رات ہم منگنی کی تقریب منائیں گے۔" اس نے بڑی شوخی سے کہا۔ "اور یہ فیصلہ صرف میں کروں گا کہ تقریب کس طرح منائی جائے گی۔ میں تمہیں اعتراض کا حق نہیں دوں گا۔"

اُس کی زندہ دلی سے متاثر ہو کر میرا دل بھی خوش ہو گیا۔ ہم وہیں گھاس پر لیٹ گئے اور سو گئے۔ بڑی ہی تیز بارش نے ہمیں جگا دیا۔ میں اس قدر خوش تھی کہ بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہ دیکھی۔ درختوں سے باہر چلی گئی۔ بارش

بڑی ہی تیز تھی۔ میں نے مُنہ اُوپر کر لیا۔ مجھے ایسا سکون محسوس ہونے لگا جیسے اس موسلا دھار مینہ نے میرے ضمیر سے گناہوں کی غلاظت اور دل سے غموں کی دُھند دھو ڈالی ہو۔ میں نے بڑے عرصے بعد بڑی زور زور سے قہقہے لگائے اور میں ہلکی پھلکی ہو گئی۔ وہ درخت کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور بھیگ رہا تھا۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر درختوں سے پرے لے گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں لے لیا اور بچّوں کی طرح ناچنے لگے۔ جتنی دیر بارش برستی رہی ہم بچّوں کی طرح کھیلتے رہے۔

مجھے وہ دن یاد آ رہے تھے جب میں نے مغربی تہذیب کی بے حیائی میں، اعلیٰ ہوٹلوں کے محبہ خانوں میں، چرس، مارجوآنا اور شراب میں، باغوں کے اندھیرے گوشوں میں تاریک راتوں میں، کار کی پچھلی سیٹ پر اور مغربی موسیقی کے ہنگامے میں، وِسما چوکڑی میں اور جنسی آزادی میں مسرّت تلاش کی تھی اور میں سمجھتی تھی کہ میں نے مسرت حاصل کر لی ہے مگر میں نے جو حاصل کیا وہ آپ کو بتا چکی ہوں۔ مجھے روحانی مسرت ملی تو مری کی اس موسلا دھار بارش میں ملی جہاں میری انگلی میں منگنی کی انگوٹھی تھی اور یہ انگوٹھی مجھے اس آدمی نے پہنائی تھی جسے میں دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ مجھ پر یہ انکشاف ہُوا کہ روحانی مسرّت دل کی پاکیزگی اور خدا کی بارش جیسی نعمتوں میں ہے۔ میں نے اس بارش میں خدا کو بہت قریب سے دیکھا اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ خدا کو کبھی ناراض نہیں کروں گی۔

مگر خدا مجھ سے ناراض تھا۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ ہم ہوٹل کے کمرے میں تھے۔ نہا کر کپڑے بدل چکے تھے۔ میرے منگیتر نے کہا تھا کہ اب ہم منگنی کی تقریب منائیں گے۔ میں نے سوچا تھا کہ تقریب یہی ہو گی کہ خاص کھانا ہو گا۔ اس کے سوا ہم اور کیا کر سکتے تھے۔ اتنے میں بیرا کمرے میں داخل ہُوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ ٹرے میں وہسکی کی بوتل، دو بوتلیں سوڈے کی، دو گلاس اور روسٹ کی ہوئی سالم مُرغی تھی۔ بیرا تپائی پر یہ چیزیں سجا کر چلا گیا تو میں نے منگیتر سے پوچھا۔ ”آپ شراب پیا کرتے ہیں؟“

”نہیں تو۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں عادی تو نہیں۔ تھوڑی تھوڑی دونوں پئیں گے۔“

میرے لئے وہسکی کوئی نئی چیز تو نہیں تھی۔ میں نے تو اس سے زیادہ تیز اور ذلیل نشے کئے تھے لیکن اپنے منگیتر کے تصور کے ساتھ میں شراب کو وابستہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے میں پاکیزہ کردار کا آدمی سمجھتی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ شادی کروں گی اور مشرقی بیوی بن کر دکھاؤں گی۔ میں نے اسے کہا۔ ”ایک شریف لڑکی کو شراب پیش کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ میں شراب پی لوں گی؟“

مجھے اس کی مسکراہٹ اچھی طرح یاد ہے۔ وہ مسکرایا تو میں نے صاف طور پر دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ میں بے ساختگی اور قدرتی پن نہیں تھا۔ میں اس کی مسکراہٹوں کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ بڑے پیارے طریقے سے مسکراتا تھا مگر مجھے شراب پیش کرتے جو مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اس میں ایسا تاثر تھا جیسے وہ خود شریف آدمی نہیں یا مجھے آوارہ سمجھتا ہے۔ طنز کا تاثر بھی تھا۔ اس نے بوتل کھولی اور تھوڑی تھوڑی وہسکی دونوں گلاسوں میں ڈال کر تھوڑا تھوڑا سوڈا بھی ڈال دیا۔

”میں نہیں پیوں گی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ پی لیں۔“

”نہ پیو۔“ اس نے روٹھ کر کہا۔ ”میں اکیلا تو نہیں پیوں گا۔ میں کوئی عادی شرابی تو نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ ہم دونوں اکیلے ہیں۔ ذرا خوشی منائیں گے۔“

میں اسے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے یہ کہہ کر گلاس اُٹھا لیا کہ شادی کے بعد نہیں پینے دوں گی۔ اس نے گلاس میرے گلاس سے ٹکرایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ میں نے رسمی طور پر گلاس مُنہ سے لگایا اور دو تین قطرے مُنہ میں ڈال لئے۔ وہ ہنسی مذاق کے موڈ میں آ گیا۔ اس نے دو تین گھونٹوں میں گلاس خالی کر دیا اور دو پیگ اور ڈال لئے۔ جتنی دیر میں میں نے پہلے دو تین گھونٹ وہسکی ختم کی اتنی دیر میں وہ چوتھائی بوتل پی چکا تھا۔ اس نے میرے گلاس میں وہسکی ڈالی، سوڈا بھی ڈالا اور بولا۔ ”یہ ایک ہی سانس میں پی جاؤ۔“

میں نے ایک ہی سانس میں تو نہ پی، ایک گھونٹ پیا اور اُسے کہا۔" اب بوتل ایک طرف رکھ دیں۔ آپ نے بہت پی لی ہے۔" میں اس کے پینے کے انداز سے جان گئی تھی کہ عادی شرابی ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔" ابھی پی ہی کہاں ہے۔" اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی اور وہ پیتے جا رہا تھا۔ ایک بار اس نے کہا۔" میں اپنی پہلی بیوی کی محبت اور اس کا غم شراب میں ڈبو دوں گا پھر اپنے آپ کو تمہاری محبت میں ڈبو دوں گا۔ تم بھی پیو اور پیو۔ کل سے ہم دونوں زاہد اور پارسا ہوں گے۔ ہیر اور رانجھا ہوں گے۔ لیلےٰ اور مجنوں ہوں گے شیریں اور فرہاد ہوں گے۔"

وہ بہک گیا تھا۔ میں اٹھی اور بوتل اٹھا کر پرے رکھ دی۔ اس وقت تک ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ اُٹھ کر بوتل کی طرف گیا تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ میں نے اسے روک لیا۔ اس نے گلاس رکھ کر مجھے بازوؤں میں لے لیا اور اس قدر زور سے اپنے ساتھ بھینچا کہ میری ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے میرے ہونٹ اپنے مُنہ میں لے لئے۔ پھر مجھے اُٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا اور میرا ازار بند پکڑ کر کھینچا۔ تب میں نے دیکھا کہ یہ وہ آدمی نہیں رہا جسے میں غمزدہ اور مخلص سمجھتی تھی۔ میں اس کے ہاتھ سے ازار بند چھڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے ہونٹ چومے اور اس سے التجا کی کہ چند دنوں میں ہماری شادی ہو جائے گی۔ یہیں اسی کمرے میں آکر ہنی مون منائیں گے۔ محبت کو ناپاک نہ کرو۔

"ہماری شادی ہو چکی ہے۔" اس نے کہا۔" آؤ ہنی مون منائیں۔" اس نے مجھے ایک بار پھر دبوچ کر پلنگ پر بٹھا دیا۔

میں پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔" میں تمہیں شریف آدمی سمجھتی رہی مگر تم شرابی اور بدکار آدمی نکلے۔ ایک شریف لڑکی کو شراب پلاتے تمہیں شرم نہیں آتی۔"

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے تحمل سے کہا۔" میری بات غور سے سنو۔ نہ تم شریف لڑکی ہو اور نہ میں شریف آدمی ہوں۔ تم شریف ہوتیں تو اتنی دلیری سے میرے ساتھ مری نہ آتیں۔ اتنی آسانی سے شراب کا گلاس ہاتھ میں نہ لے لیتیں.... سنو سویٹ! میں تمہارے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔ برقعہ تمہارے ماضی کو نہیں چھپا سکتا۔ دفتر میں بہت لوگ آتے ہیں۔ دو آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم کون ہو اور کیا ہو لیکن میری نظر میں تم احسان فراموش اور خود غرض ہو۔ میں نے تمہیں نوکری دلوائی۔ اتنی زیادہ تنخواہ مقرر کروائی۔ تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر دفتر میں تمہاری پوزیشن بنائی لیکن تم ذرا سی دیر کے لئے مجھے اپنا یہ جسم دینے سے انکار کر رہی ہو جو بے شمار لوگوں کو دے چکی ہو۔"

"میں نے تمہیں یہ جسم ساری عمر کے لئے دے دیا ہے۔" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ صدمہ میری روح کو بھی کچل گیا کہ وہ میرے ماضی سے واقف تھا۔

"تم نے مجھے دھوکے میں رکھا ہے۔" اس نے کہا۔" میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں مگر مجھے یہ نہیں بتانا چاہتی تھیں کہ تم بہت سے آدمیوں کی چھوڑی ہوئی ہو۔" وہ بہک گیا تھا۔ نشے میں اور عشق میں انسان دل کے راز اُگل دیتا ہے کیونکہ اسے اپنے آپ پر قابو نہیں ہوتا۔ یہی حالت اس کی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔" میری قربانی دیکھو کہ تمہاری خاطر اپنی اچھی بھلی نیک بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کہاں ہے تمہاری بیوی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے گھر میں۔" اس نے جھوم کر کہا۔" میرے بچے کو دودھ پلا رہی ہو گی۔" اس نے گلاس میں پڑی ہوئی وہسکی حلق میں انڈیل لی اور اُٹھ کر ڈگمگاتا ہوا میری طرف آیا۔ دوستانہ لہجے میں کہنے لگا۔" ایسی پتھر اور پاکباز نہ بنو۔"

آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ مجھے کتنا صدمہ ہوا ہو گا۔ زمین و آسمان گھوم گئے۔ میں خوش تھی کہ منزل پا لی ہے۔ مگر منزل بھٹکی ہوئی تھی۔ میرے اندر نفرت احتجاج، انتقام اور گلوں شکووں کا طوفان اُٹھا مگر میں نے سینے میں ہی روک لیا۔ کچھ کہنا بیکار تھا۔ اسے سچی محبت کا واسطہ دینا بے معنی تھا۔ اس نے میرے ساتھ ناٹک کھیلا تھا۔ وہ میرے اعصاب اور دل پر پوری طرح قابض ہو کر مجھے مری لے جانا چاہتا تھا۔ اس حد تک وہ کامیاب تھا۔ مجھے اس کی بیوی پر ترس

آنے لگا جو اس کے کہنے کے مطابق نیک اور شریف تھی۔ وہ بے چاری گھر بیٹھی اس کا بچّہ پال رہی تھی اور یہ بدکار مری میں عیش کر رہا تھا۔

وہ بار بار مجھے بازوؤں میں جکڑ لیتا تھا۔ اس سے پیچھا چھڑانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں ایسے مردوں کا علاج جانتی تھی۔ میں نے فوراً رویّہ بدل لیا اور اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے گلاس میں وہسکی ڈالی اور سوڈا ڈالے بغیر گلاس اس کے مُنہ کے ساتھ لگا دیا۔ عورت خصوصاً مجھ جیسی جوان اور خوبصورت جو ایکٹنگ بھی کر سکتی ہو، بڑے بڑے جابر مردوں کو انگلیوں پر نچا دیتی ہے۔ میں نے گلاس اس کے مُنہ سے لگایا اور ایک بازو اس کے گرد لپیٹ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ میں نے ہنس کر کہا: "تم پاپی ہو"

"ہم پاپی ہیں" اس نے نعرہ لگانے کے انداز سے کہا۔ "سارا پاکستان پاپی ہے۔ اور پلاؤ۔ ہمیں اور پلاؤ۔ گھر میں بیوی حرامزادی ہمیں سگریٹ بھی نہیں پینے دیتی ـــ" وہ گلاس خالی کر کے میرا گال چُوسنے لگا۔ میں نے اسے اور وہسکی سوڈے کے بغیر پلا دی۔ وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ میں اٹھی تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے جھٹکا دیا تو وہ پیٹھ کے بل پلنگ پر گر پڑا۔ بڑی مشکل سے اٹھا اور بازو پھیلا کر میری طرف آیا لیکن دو قدم چل کر رُک گیا۔ اس کا جسم ڈول رہا تھا۔ میں نے اسے جو خالی وہسکی پلائی تھی، اس نے اس کا دم خم ختم کر دیا تھا۔

میں نے پوری طاقت سے اس کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ اس تھپڑ میں اتنی طاقت نہیں تھی جتنی نفرت اور انتقام کی آگ تھی۔ وہ لڑکھڑایا۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا تو وہ پلنگ پہ اس طرح جا پڑا کہ گھٹنے فرش پر ٹکے ہُوئے تھے اور اُوپر کا دھڑ پلنگ پر۔ پھر وہ اُٹھ نہ سکا۔

میں نے بتی بجھا دی اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مری کے ساون کی رات سرد تھی۔ مری کی روشنیاں میرے سامنے پھیلی ہوئی تھیں۔ میں منزل پر آ گئی تھی مگر یہ منزل نہیں سراب تھا۔ میں ایسی بے تحاشا روئی کہ ہچکی بندھ گئی۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک انسان یاد آنے لگا۔ ہر لمحہ اور ہر انسان گناہ میں ڈوبا ہُوا نظر آیا۔ مجھے اپنا بچّہ بھی یاد آیا۔ میں پہلی بار بچّے کو یاد کر کے

روئی اور ایسی روئی جیسے کسی بچّے کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔ ذہن میں خیال آیا کہ میرا بچّہ دنیا کا واحد مرد ہے جس سے مجھے فرشتوں کے ہاتھوں کا دُھلا ہُوا پیار مل سکتا ہے۔ اس خواہش نے مجھے تڑپا دیا کہ عیسائیوں سے جا کر اپنا بچّہ واپس لے لوں اور اسے سینے سے لگا کے کہوں: "آ میرے جگر کے ٹکڑے ہم دونوں سراپا گناہ ہیں۔ آ مسجدوں اور گرجوں کی دنیا سے کہیں دُور چلے چلیں جہاں ہمیں خدا مل جائے"

میں جذبات میں بہہ نکلی اور کھڑکی میں کھڑی روتی رہی۔ میرے سامنے گزری ہوئی زندگی کی فلم چلتی رہی اور اچانک مری کی ساری روشنیاں ایک چکر میں گھوم گئیں۔ میری سوچوں کا دھارا پیچھے کو پھر گیا۔ میں نے بتی جلا دی اور لپک کر وہسکی کی بوتل مُنہ سے لگا لی۔ ٹرے میں سالم روسٹ مرغی رکھی تھی۔

میں نے چھُری اُٹھائی۔ مُرغی کی بوٹیاں کاٹ کر کھانے لگی۔ وہ بدبخت فریب کار آدھا پلنگ پر اور آدھا فرش پہ پڑا تھا۔ وہ صبح تک اُٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ آدھی مُرغی اور سلاد کھا کر اور کافی وہسکی پی کر میری اداسیاں ڈوب گئیں۔ شکست فتح میں بدل گئی۔ میں خود بدل گئی۔ دماغ کسی اور سمت چل پڑا۔ مجھے اپنا وجود ناپاک اور نجس محسوس ہونے لگا۔ میرے جن بالوں اور آنکھوں اور گوری رنگت پر مرد بھٹک جاتے تھے، وہ بکاؤ چیزیں معلوم ہونے لگیں۔ اتنی کوششوں اور اتنے تجربوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میں دھتکاری گئی ہوں۔ راندۂ درگاہ ہوں۔ میرے وہ چار محسن مجھے کب تک چھپائے رکھیں گے۔ اَب میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔

کچھ تو میں جوان ہی بے حیا ماحول میں ہوئی تھی، زیادہ تر شراب کا اثر تھا کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مردوں کے جال میں ہی بار بار پھنسنا ہے اور دھوکے پہ دھوکہ کھانا ہے تو کیوں نہ میں خود ہی دھوکہ بن جاؤں؛ میں کہاں کی شریف زادی ہوں؟ مجھے سکون سا محسوس ہونے لگا۔ میں چونکہ نشے میں تھی اس لئے عقل میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میں نے یہ نہ سوچا کہ نئی زندگی کا آغاز کس طرح کروں۔ مجھے ایک ٹھکانہ چاہیئے اور ایک آدمی کی بھی ضرورت ہوگی۔ میں ابھی نشے اور

جذبات میں تھی۔ میں کمرے سے نکل گئی۔ نیچے اُتری اور باہر نکل گئی۔ آگے ہوٹل کا لان تھا۔ اس سے آگے اترائی تھی۔ لان میں ایک یورپین جوڑا بیٹھا تھا۔ میں اترائی کے قریب ٹہلنے لگی۔

"کرسی لادوں؟" کسی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے گھوم کے دیکھا۔ ہوٹل کا مینجر تھا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے کہا کہ ذرا ٹہلنے نکلی ہوں۔ وہ غالباً جان گیا کہ میں پیتے ہوتے ہوں۔ اس نے ایک بیرے کو آواز دے کر دو کرسیاں منگوالیں اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"آپ کے صاحب تو بے ہوش پڑے ہیں۔" اس نے کہا۔ "بہت پی گئے ہیں۔ میں اُدھر سے گزر رہا تھا تو دیکھا تھا۔ یہ آپ کے خاوند ہیں؟"

"دوست ہے۔" میں نے جواب دیا۔ وہ دلچسپی سے باتیں سُننے اور کرنے لگا۔ میں نے اپنے بیہوش دوست کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہہ دیں جن سے اسے معلوم ہوگیا کہ میں اسے پسند نہیں کرتی۔ اس نے پوچھا کہ میں اسے کس طرح جانتی ہوں۔ میں نے بتایا کہ اس کی کمپنی میں ملازم ہوں۔

"تنخواہ کتنی ہے؟"

"سوا پانچ سو روپے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں آپ کو ایک صاف سی بات کہہ دوں، آپ بُرا تو نہیں منائیں گی؟" اس نے پوچھا اور جب میں نے کہا کہ کہیئے تو اس نے کہا۔ "اس قسم کے بدکار آدمی کے ساتھ ہی اگر سیر کرنی ہے اور اسے ملازمت کی وجہ سے خوش رکھنا ہے تو یہ سودا آپ کے لئے بہت مہنگا ہے۔ آپ کو یہی ڈر ہے نا کہ اسے خوش نہ رکھا تو یہ آپ کو ملازمت سے نکلوا دے گا؟" اس نے میرا جواب سُننے بغیر کہا۔ "اس ہوٹل میں غیر ملکی لوگ آتے ہیں۔ مجھے آپ جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ آپ سوا پانچ ہزار روپیہ ماہوار آسانی سے کما سکتی ہیں۔ آپ کی رہائش اسی ہوٹل میں ہوگی۔"

میں نے انکار نہیں کیا۔ اس نے اس آدمی کے متعلق بتایا کہ بدکار اور عیاش آدمی ہے۔ ہوٹل کے مینجر کے اس کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ آدمی گرمیوں میں دو تین مرتبہ مری آتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی ہوتی ہے اور وہ چند دن اسی ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔

"مجھے الگ کمرہ دے دیں۔" میں نے مینجر سے کہا۔ "مجھے ذرا سوچنے دیں۔ کل صبح جب وہ ہوش میں آتے تو اسے میرے متعلق کہہ دیں کہ میں آپ کو بتا کر واپس چلی گئی ہوں۔"

مینجر نے مجھے نہایت اچھا کمرہ دے دیا۔ سجا سجایا فراخ کمرہ تھا مگر مجھے پھانسی کی کوٹھڑی کی طرح ہولناک لگا۔ میں ڈرتے ڈرتے اس بدکار کے کمرے میں گئی۔ میرے کپڑے اور کچھ چیزیں وہاں پڑی تھیں۔ وہ پلنگ سے لڑھک کر فرش پر پڑا تھا اور بیہوش تھا۔ میں نے اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں سمیٹیں، اٹیچی کیس اُٹھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں سوچنے لگی کہ میرا فیصلہ بدلنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے یا نہیں ....کوئی صورت نہیں تھی۔ میرے حال اور مستقبل پر میرا ماضی سیاہ گھٹا کی طرح چھا گیا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ سوسائٹی میں کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو مجھے اپنی بیوی بنالے گا اور میرے جسم کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہے گا۔ میرے لئے یہی ایک راستہ رہ گیا تھا جو مینجر نے مجھے دکھایا تھا۔

میں مہذب طوائف بن گئی

میں سوچتے سوچتے سو گئی۔ صبح منیجر آیا تو میں نے اسے فیصلہ سنادیا کہ میں اس ہوٹل میں رہوں گی۔ میں پیشہ ور عصمت فروش تو نہیں تھی اور نہ کبھی پیشہ ور عورت دیکھی تھی۔ باتیں سُنی تھیں جو سب میرے ذہن میں آئیں۔ میں نے جب منیجر کو اپنا فیصلہ سنایا تو مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جو میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے رونا چاہیئے تھا مگر میری آنکھیں خشک تھیں۔ خوش ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حیرت اس پر ہے کہ میں غمگین بھی نہیں تھی۔ مجھے اُس وقت کچھ بھی یاد نہ آیا۔ گھر نہ ماں باپ نہ بھائی نہ وہ سہیلیاں جنہیں میں صرف اس لئے حقیر سمجھا کرتی تھی کہ وہ گندے گندے اُردو سکولوں میں پڑھتی تھیں۔ مجھے وہ دوست بھی یاد نہ آئے، جن کے ساتھ میں نے عیش کی اور عصمت فروشی تک پہنچی تھی۔

"میں کوٹھے والی طوائف نہیں بنوں گی"، میں نے جذبات سے خالی لہجے میں کہا۔

"تم کس وہم میں مبتلا ہو گئی ہو؟" اس نے کہا۔ "اس ہوٹل میں تمہیں بڑی اچھی حیثیت دی جائے گی۔ تم اونچے درجے کے مہمانوں اور غیر ملکی امیرزادوں کی دیکھ بھال کیا کرو گی۔ ان کا استقبال کرو گی، اور ان میں سے کوئی تمہارے ساتھ تفریح کرنا چاہے گا تو اس سے مُنہ مانگی فیس لو گی، لیکن وہ آدمی بہت اونچی حیثیت کا ہونا چاہیئے۔ تم اتنی سستی چیز نہیں ہو کہ میں تمہیں ہر کسی کے سامنے پھینکتا پھروں گا۔ تم اس ہوٹل میں شراب اور رقص پارٹیوں میں باعزت طور پر شریک ہوا کرو گی۔"

ان باتوں سے مجھے قدرے اطمینان ہُوا۔ اس نے مجھے اپنی شرائط بتائیں

جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گی۔ میں نے ان میں سے کچھ مان لیں کچھ نہیں مانیں۔

میں نے اسے اپنی شرائط بتائیں۔ ان میں سے اُس نے کچھ مانیں کچھ نہ مانیں۔ میں دراصل ہوٹل کی قیدی نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں اس سے یہ شرط منوانا چاہتی تھی کہ میں برقعے میں باہر گھوموں پھروں گی اور اپنی پسند کا گاہک یا دوست اپنے ساتھ لانے میں آزاد ہوں گی۔ اُس نے یہ شرط مان لی اور پھر ہم نے باقی شرائط بھی طے کر لیں۔ اُس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ اس ہوٹل میں کس قسم کے لوگ آتے ہیں، وہ کیا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہاں باہر سے لڑکیاں منگوائی جاتی ہیں۔

میرے لئے اب رونا، پچھتانا، اپنے آپ کو یا دوسروں کو کوسنا اور کُڑھنا محض بیکار تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنے آپ کو مظلوم نہیں کہوں گی اور کسی سے ہمدردی اور پیار کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ میں نے منیجر کو صاف الفاظ میں بتا دیا کہ اگر اُس کے دل میں یہ خیال ہے کہ میں چونکہ اُس کی محتاج ہوں اس لئے اس کی بلا اُجرت داشتہ بنی رہوں گی تو وہ اس خیال کو دل سے نکال دے۔ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ اس کے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔ بہر حال مجبور اور بے سہارا ہونے کے باوجود میں نے اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں مجبور ہوں۔ مجھے اپنی قیمت کا اندازہ تھا۔

میں مہذب طوائف بن گئی — اپنے خوابوں کو کانچ کی چوڑیوں کی طرح توڑ ڈالا۔ شادی کو ذہن سے نوچ کر پھینک دیا اور یکسر فراموش کر ڈالا کہ میں کسی کی بیٹی اور کسی کی بہن ہوں۔ منیجر مطمئن ہو کر چلا گیا۔ چند گھنٹوں بعد اُس نے مجھے بتایا کہ میرا ایک دن کا منگیتر واپس چلا گیا ہے۔ میں نے اس کی محبت کو دفن کر دیا۔

چند دنوں میں ہی پاکستان کی سوسائٹی ننگی ہو کر میرے سامنے آگئی۔ وہ بزرگ بھی میرے پاس آکر ننگے ہو گئے جو اُٹھتے بیٹھتے یہی ایک مطالبہ دہراتے ہیں۔ "پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ یہاں شراب اور عصمت فروشی کا خاتمہ ہونا چاہیئے"۔ وہ شراب پی کر میرے پاس آتے، اور وہ بھی میرے پاس آتے جو پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کے وعدے کرتے رہتے ہیں۔

اگر آپ میں اتنی جرأت ہے کہ قوم کے غم کو شراب میں ڈبونے والے سیاسی لیڈروں کے نام شائع کریں تو میں آپ کو بتا دیتی ہوں لیکن آپ یقین نہیں کریں گے اور اگر آپ ان کے نام شائع کرنے کی جرأت کریں گے تو آپ باہر گھومتے پھرتے نظر نہیں آئیں گے۔ اگر آپ ۱۹۶۴ء کے اخبار دیکھیں تو ان کے پہلے صفحوں پر ایوب کی حکومت کے ایک وزیر کا بیان شائع ہوا تھا جس میں اُس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ "ہم پاکستان میں خلفائے راشدین کا نظام رائج کر کے دم لیں گے"۔ یہ بیان اُس نے مری سے اخباروں کو بھیجا تھا۔ میں نے مری ہی میں پڑھا تھا۔ اُسی رات اُس کی فرمائش پر کہ "تازہ مال" چاہیئے، میں اس کے کمرے میں گئی تھی اور اُس وقت وہاں سے واپس آئی تھی جب شراب اور نیند نے اُسے بیہوش کر دیا تھا۔ میں اس سے یہ نہ پوچھ سکی۔ "جناب، کیا خلفائے راشدین کے نظام میں بھی کچھ ہوتا تھا؟"

یہ صرف ایک مثال ہے۔ اگر میں آپ کو ہر اُس آدمی کے متعلق بتانے لگوں جو میرے پاس آتے رہے اور اب بھی آتے ہیں تو آپ یقین نہیں کریں گے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ پاکستان میں قرآنی نظام لانے والے دو مذہبی لیڈر میرے مستقل گاہک ہیں؟ مجھے پاکستان کی مخلوق پر ترس آتا ہے جو ان کے نام پر "زندہ باد" کے نعرے لگاتی ہے اور اپنی قسمت ان بیانوں اور تقریروں سے وابستہ کر رکھی ہے۔ ذرا تصور فرمائیں کہ یہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ لیڈر پاکستان کو سرمایہ داری کے نظام سے نجات دلائیں گے جو میرے ہاتھ سے شراب پیتے ہیں اور دولت لٹاتے پھرتے ہیں۔ یہ اسی ملک کی دولت ہے۔ غریب عوام کی دولت جو وہ لُوٹ رہے ہیں اور اس کا بیشتر حصّہ "تازہ مال" اور سمندر پار کی شراب میں اُڑا رہے ہیں۔

کشمیر کو بزورِ شمشیر آزاد کرانے والوں نے بھی میرے ہاتھ سے شراب پی اور رات میرے ساتھ گزاری ہے، بلکہ کئی راتیں میرے ساتھ گزاری ہیں۔ قوم کے غم میں گھلنے والے ایڈیٹر بھی میرے پاس آکر اسی طرح ننگے ہو گئے کہ میں نے ان کے ضمیر بھی دیکھ لئے۔ میرے پاس قانون شکن

بھی آتے ہیں اور قانون کے محافظ بھی۔ ملک اور ملک کے حاکموں کے جو راز میرے سینے میں ہیں یا میری قماش کی عورتوں کے سینوں میں ہیں وہ کسی اور کو معلوم نہیں، عورت بادشاہ کی بھی کمزوری ہے، گداگر کی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی کامیاب جاسوسی ایک عورت کر سکتی ہے، ایک دلیر اور قوی ہیکل مرد بھی نہیں کر سکتا۔

حسن و جوانی نے قانون کو بے بس کر دیا

اب میں آپ کو جو باتیں بتاؤں گی، وہ بہت احتیاط سے بتاؤں گی شہروں کا نام نہیں بتاؤں گی۔ کسی آدمی کا نام نہیں بتاؤں گی۔ آپ مجھ سے کوئی سوال نہ پوچھیں کیونکہ آپ کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ میں جو کچھ بتانا بہتر سمجھتی ہوں وہ سناتی جاؤں گی۔ آپ لکھتے جائیں۔ میں آپ کو ایک بار پھر یاد دلا دیتی ہوں کہ میں بازاری طوائف نہیں تھی اور نہ ہی میں اُن بیسواؤں میں سے تھی جو گاہک پھانستی پھرتی ہیں اور ایک ایک رات میں کئی کئی بار فروخت ہوتی ہیں۔ میں ہوٹل میں رہتی تھی۔ ہوٹل میں آنے والے غیر ملکیوں اور اپنے ہی ملک کے دولت مندوں کے ساتھ اس طرح اُٹھتی بیٹھتی تھی جیسے میں ہوٹل کے مالک کی بیٹی ہوں یا ہوٹل کی انتظامیہ کی انچارج ہوں۔ میں شراب اور ناچ کی پارٹیوں میں شریک ہوتی تھی اور اس دوران چند ایک کی فرمائش کو ٹھکرا کر اپنی پسند کا کوئی اونچا آدمی پھانس لیتی تھی لیکن ایسے ناز نخروں کے ساتھ کہ کسی کو شک نہیں ہوتا تھا کہ میں طوائف ہوں اور ہوٹل ہی میں رہتی ہوں۔ مجھ سے ایڈریس اور ٹیلیفون نمبر پوچھا جاتا تھا اور میں جواب دیا کرتی تھی۔ "ڈیڈی کہتے ہیں کہ کسی کو اپنا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر نہ بتانا۔"

اس قسم کی عصمت فروشی وہ لڑکیاں بھی کرتی ہیں جنہیں ماں باپ نے ایڈوانس اور ماڈرن بنا رکھا ہے اور انہیں فخر سے ان پارٹیوں میں لایا کرتے ہیں جہاں شراب چلتی ہے اور ڈانس ہوتا ہے۔ مغربی تہذیب میں ڈوبی ہوئی بیویاں بھی اپنے خاوندوں کی موجودگی میں ایسی عصمت فروشی کرتی ہیں جو میں کالج کے زمانے میں ان یورپی طرز

کے ہوٹلوں میں کیا کرتی تھی۔ امیر گھرانوں کی لڑکیاں وہاں کیوں جایا کرتی تھیں؟ یہ میں آپ کو تفصیل سے سنا چکی ہوں مگر انہیں کوئی طوائف اور بیسوا نہیں کہتا کیونکہ ان کے گھر گھاٹ ہیں، ان کے باپ اور خاوند انہیں باعزت طریقے سے گھر لے جاتے ہیں اور اس بے حیائی کو نئی تہذیب کہتے ہیں مگر میں اب عصمت فروش تھی کیونکہ میرا کوئی گھر نہیں تھا، کوئی باپ نہیں اور کوئی خاوند نہیں تھا۔

یہ محفلیں میری دیکھی بھالی تھیں۔ مجھے انگریزی بولنی آتی تھی۔ اداکاری بھی آتی تھی، خدا نے شکل بھی دی تھی، عمر بھی اور قدوقامت میں بھی جاذبیت تھی۔ کوئی بھی مجھے بکاؤ مال نہیں سمجھتا تھا پھر بھی میں ان سے منہ مانگے دام وصول کر لیا کرتی تھی۔ تحفے تحائف الگ تھے۔ میں دو مہینوں میں اس ماحول میں رچ بس گئی اور اپنے فن میں مہارت حاصل کر لی۔ مہارت بھی اس قدر حاصل کر لی کہ تیسرے مہینے کے ایک روز ہوٹل کے مینجر نے پولیس کے ایک بہت بڑے افسر کا نام لے کر مجھے کہا "بڑا ہی خبیث انسان ہے جب کبھی یہاں آتا ہے، اس ہوٹل میں مفت ٹھہرتا ہے۔ سب سے زیادہ قیمتی شراب مفت پیتا ہے اور ہر بار "تازہ مال" کی مفت فرمائش کرتا ہے۔ ہماری جان اس کی مٹھی میں ہوتی ہے۔ اس خبیث افسر کی ہر ایک فرمائش ہمیں پوری کرنی پڑتی ہے۔ آج رات تمہیں اس کے کمرے میں جانا پڑے گا۔ فیس مجھ سے لے لینا۔ یہ کافر مفت کا گاہک ہے۔"

وہ واقعی خبیث انسان تھا مگر جسے مینجر نے مفت کا گاہک کہا تھا وہ جب دوسرے دن ہوٹل سے رخصت ہوا تو اس کا سات سو روپیہ میرے پرس میں تھا۔ میں نے اس سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اپنی مظلومیت کا اظہار نہیں کیا تھا صرف اتنا کیا تھا کہ اسے انگلیوں پر نچا لیا تھا۔ اس نے مجھے سات سو روپیہ فیس کے طور پر نہیں دیا تھا بلکہ یہ کہہ کر دیا تھا "میرے پاس کل اتنا وقت نہیں ہوگا کہ تمہارے لئے کوئی تحفہ خرید لاؤں۔ یہ پیسے رکھ لو میری طرف سے اپنی پسند کا کوئی تحفہ خرید لانا۔"

مری کا سیزن ختم ہو رہا تھا۔ مال کی شامیں ویران ہونے لگیں تھیں مگر میرے ہوٹل کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تیس اور چالیس سال کے درمیان کی

عمر کا ایک آدمی ہوٹل میں چند دنوں کے لئے آیا۔ کسی ریاست کا نواب لگتا تھا۔ میرا اس سے تعارف ہوا تو زندہ دل آدمی نکلا۔ مینجر کی اس کے ساتھ بے تکلفی تھی۔ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ خوش گفتار انسان تھا۔ میں اس کے ساتھ کھل گئی۔ کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ بہت دیر گپ شپ چلتی رہی۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ اس کا انداز اُن مردوں کی طرح نہیں تھا جو مجھے اپنے کمرے میں لے جایا کرتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے اس میں ذرہ بھر دلچسپی نہ ہو کہ میں حسین اور نوجوان لڑکی ہوں۔ میں نے بھی اسے کوئی ایسا اشارہ نہ دیا کہ میں کاروباری لڑکی ہوں اور مجھے جلدی فارغ کرے۔ مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور میں بہت حد تک مطمئن تھی کہ وقت گزارنے کے لئے یہ اچھا ساتھی ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد وہ مطلب کی بات پر آیا اور بولا "مینجر نے مجھے تمہارے متعلق بتایا ہے کہ تم نئی نئی آئی ہو لیکن میں تمہیں اس مقصد کے لئے کمرے میں نہیں لایا۔ میں تمہیں چند دنوں کے لئے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ جو مانگو گی دوں گا لیکن میں تمہیں اپنی داشتہ بنا کر نہیں لے جاؤں گا۔ کار پر لے جاؤں گا۔ کار پر ہی چھوڑ جاؤں گا۔"

ظاہر ہے کہ میں فوراً ہی رضامند نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ مجھے کہاں اور کیوں لے جائے گا تو اس نے پوری تفصیل سے مجھے سمجھا دیا۔ اس نے یہ بھی کہا "اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہ ہو تو پچاس ہزار، ایک لاکھ، دو لاکھ روپیہ تمہارے نام بنک میں جمع کرا دوں گا۔" میں نے اس کی ضرورت سمجھ لی اور کسی نقد ضمانت کے بغیر اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

اس کا کام مختصراً یہ تھا کہ وہ نامی گرامی سمگلر تھا۔ اس کا مال جس کی مالیت پچیس لاکھ سے زیادہ تھی اور جس سے اس نے پاکستان میں چالیس لاکھ روپیہ کمانا تھا، ایک جگہ رُکا ہوا تھا۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ سمگلنگ صرف افسروں کے ہی تعاون سے نہیں ہوتی بلکہ سمگلروں کو وزیروں کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان کا آپس میں حصے پر جھگڑا ہو جاتا ہے تو سمگلروں کی جان پر بن جاتی

ہے۔ وہ چونکہ مجرم ہوتا ہے، اس لئے اسے گرفتاری کا ڈر ہوتا ہے۔ اس سمگلر کے سامنے بھی یہی مشکل پیش آگئی تھی۔ جھگڑا یہ تھا کہ اس کا بیس لاکھ کا مال اپنی سرحد کے باہر ہی ہندوستان میں پکڑا گیا تھا مگر پاکستان کا ایک بہت بڑا افسر جو اس کا حصہ دار تھا، کہتا تھا کہ وہ اسے دھوکہ دے رہا ہے کہ مال ہندوستان میں پکڑا گیا ہے۔

اس سمگلر نے مجھے بتایا کہ افسر پولیس کا بہت بڑا افسر ہے۔ اس نے سمگلر کو دھمکی دی ہے کہ مال کا حصہ ادا کرو پھر اس مال کا پیشگی حصہ دو، ورنہ مال سرحد سے اس طرف نہیں آسکے گا۔ مال خطرناک جگہ پڑا تھا۔ یہ سمگلر مجھے رشوت کے طور پر اس افسر کے پاس بھیجنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ عورت اس کی بہت بڑی کمزوری ہے مگر کوئی عورت اسے رام نہیں کرسکتی۔ "میں تمہیں پچھلے چار دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔" سمگلر نے مجھے کہا۔ "تم میں مجھے وہ جادو نظر آیا ہے جو اس شیطان کو شیشے میں اُتار سکتا ہے۔"

اس نے مجھے سمجھایا کہ میں اسے کس طرح رام کرسکتی ہوں۔ میں نے سوچا کہ یہ تجربہ کر دیکھتے ہیں۔ اسے کہہ دیا کہ میں چلوں گی۔ رات دو بجے تک ہم اس مہم پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ مجھے ہر لمحہ توقع تھی کہ یہ سمگلر مجھے کہے گا کہ آؤ میرے ساتھ ہی سو جاؤ مگر اس نے کہا۔ "تم جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔" میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن ہوٹل کے مینجر نے التجا کے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "تم ہمیشہ کے لئے جا رہی ہو؟ میں احسان تو نہیں جتاؤں گا۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے تمہیں یہاں بدنام نہیں ہونے دیا۔ جس کسی نے تمہارے متعلق پوچھا، میں نے یہی بتایا کہ آزاد خیال لڑکی ہے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا کہ تم کال گرل (پیشہ ور عصمت فروش) ہو۔"

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، مجھے اس کا احساس تھا اور میں اس کی ممنون تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں واپس آجاؤں گی اور اس سے پوچھا کہ میں جس کام کے لئے جا رہی ہوں اس کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ اس نے کہا۔ "اگر تم اس

لائن پر چل نکلو تو بُری نہیں۔ ہوٹل کی زندگی سے بہتر ہے۔ بہت اونچے لوگوں سے میل ملاقات ہوتی ہے خطرہ یہ ہے کہ سمگلنگ خطرناک پیشہ ہے۔ سکینڈل بہت بنتے ہیں، قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ زندگی پُراسرار ہے مگر شاہانہ ہے۔ وہاں تمہیں کوئی بھی عصمت فروش نہیں کہے گا۔" اس نے مجھے کچھ ہدایات دیں۔

رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا۔ میں اُس ماڈل کی کار میں مری سے نکلی جس ماڈل کی کاریں وزیروں کو دی جاتی ہیں۔ سمگلر میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور اس کے دو ساتھی اگلی سیٹ پر تھے۔ ان میں سے ایک کار چلا رہا تھا۔ سمگلر نے مجھے کہا۔ "نیند آتے تو بتا دینا۔" آپ کے ذہن میں ان سمگلروں کا تصور یقیناً یہی ہو گا کہ وہ شراب میں بدمست ہوں گے۔ بیہودہ باتیں کرتے ہوں گے۔ ہلڑ بازی کرتے ہوں گے۔ کار میں میرے ساتھ فحش حرکتیں کرتے ہوں گے، مگر یہ آپ کا تصور صحیح نہیں۔ میرے اپنے ذہن میں سمگلر کی تصویر یہی تھی لیکن وہ تینوں پیتے ہوتے نہیں تھے حالانکہ پینے والے تھے۔ رات سمگلر نے مجھے سب سے زیادہ قیمتی شراب پلائی تھی لیکن رات کے سفر میں وہ ہوش میں رہنا چاہتے تھے۔ وہ اس طرح کی شریفانہ گپ شپ لگا رہے تھے جیسے اچھے گھرانوں کے تہذیب یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔ میرے پاس بیٹھے ہوتے سمگلر نے جب مجھے کہا کہ نیند آتے تو بتا دینا تو میں نے جواب دیا۔ "نیند تو مجھے ابھی سے آرہی ہے۔" وہ سیٹ کے آخری کونے میں سرک گیا۔ میرا سر تھام کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور کہا کہ پاؤں اُوپر کر لو۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ کار خاصی چوڑی تھی۔ اَب مجھے توقع تھی کہ وہ میرے بالوں پر ہاتھ پھیرے گا۔ میرے جسم پر ہاتھ پھیرے گا۔ جھک کر میرے مُنہ سے مُنہ ضرور لگاتے گا لیکن اُس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس کے کسی دوست نے اس کی گود میں سر رکھ دیا ہو۔ اگر وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتا تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں کوئی شریف لڑکی تو نہیں تھی نہ وہ شریف آدمی تھا لیکن وہ مجھے کسی اور مقصد کے لئے ساتھ لے جا رہا تھا، اپنی عیاشی کے لئے نہیں۔ میری آنکھ لگ گئی۔

اور جب میری آنکھ کھلی میں اس کی پُراسرار دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ کار سے نکال کر وہ مجھے کسی کوٹھی کے ایک بڑے ہی خوبصورت کمرے میں لے گیا۔ ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ اس نے ایئر کنڈیشنر چلا کر مجھے کہا "سو جاؤ جب جی چاہے اُٹھنا" میرا خیال تھا کہ یہ ڈبل بیڈ ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ سوتے گا مگر وہ بتی بجھا کر چلا گیا۔ مجھے نیند نے بے حال کر رکھا تھا میرے ذہن میں کوئی وہم اور خدشہ نہیں تھا۔ عورت کو صرف یہ ڈر ہوتا ہے کہ کوئی اس کی عصمت پر نہ ہاتھ ڈالے۔ میں وہ عورت تھی جو اپنی عصمت سے دستبردار ہو چکی تھی۔ میں اپنی عصمت اپنے ہاتھوں کتوں کے آگے پھینک چکی تھی۔ میں پلنگ پر لیٹی اور گہری نیند سو گئی۔

اگلے روز ساڑھے گیارہ بجے میری آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کر اور ناشتہ کر کے فارغ ہوئی تو وہ کمرے میں آیا۔ مجھے ناشتہ کمرے میں ہی دیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو اُس نے مجھے بڑے غور سے دیکھ کر کہا "میری دو باتیں دھیان سے سُنو۔ ایک یہ کہ تمہارے بال غیر معمولی طور پر نفیس ہیں۔ انہیں کٹوانا نہیں۔ دوسری بات یہ یاد رکھنا کہ بالوں میں تیل نہ ڈالنا۔ بہت ہی عجیب بال ہیں" پھر وہ کام کی باتیں کرنے لگا۔ آخر میں اس نے کہا "تمہارے سینے پر کوئی پستول رکھ دے تو بھی نہ بتانا کہ تم کون ہو اور کہاں رہتی ہو لیکن تمہارے سینے پر کوئی پستول رکھے گا نہیں۔ تم آنکھوں سے بھی مسکرانا جانتی ہو۔ تمہاری آنکھوں کی مسکراہٹ سے پستول کی نالیاں جھک جائیں گی"

اور ہُوا بھی ایسے ہی۔ میں نے دوسرے ہی دن پتھر کو موم کر لیا۔ کیسے کر لیا؟ کہاں کر لیا؟ ان سوالوں کا جواب نہیں دوں گی۔ صرف اتنا بتا دیتی ہوں کہ میری مسکراتی آنکھوں، میری جوانی اور میرے حسن نے قانون کا پستول جھکا دیا۔ دو دشمن ملکوں کی باہمی سرحد مٹ گئی۔ ٹیلیفون پر صرف ایک جُملہ بولا گیا۔ یہ ایک جُملہ بولنے کے لئے میں ساری رات وہاں رہی۔ بیس لاکھ کا مال سرحد کے اندر آ گیا اور غائب کر دیا گیا۔ یہ شراب اور عورت کا کرشمہ تھا۔ اس گروہ میں تو ایک سے ایک بڑھ کر حسین لڑکی تھی مگر مجھے پتہ چلا کہ ان کا انداز پیشہ ورانہ تھا۔ وہ رشوت کے طور افسروں کے پاس جاتی تھیں تو صاف پتہ چل جاتا تھا کہ کال گرلز ہیں۔ میرا انداز کچھ اور تھا۔ میں جب اُسے ملی تو اُسے بتایا کہ میں فلاں کی سفارش لے کے آئی

ہوں۔ اس نے کہا "اس سے پہلے چار لڑکیاں اس کی سفارش کرنے آ چکی ہیں۔ وہ بے ایمان سمجھتا ہے کہ مجھے طوائفوں کے جال میں پھانس لے گا۔ اب تم آئی ہو"

میں بھڑک اُٹھی اور کہا "آپ مجھے بھی طوائف سمجھ رہے ہیں؟ اگر میں آپ کو بتا دوں کہ میں کون ہوں تو آپ میرے پاؤں پکڑ کر مجھ سے معافی مانگیں گے"

وہ گھبرا گیا لیکن کایاں شخص تھا۔ بولا "آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ میں کون ہوں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ ایک ایسے مجرم کی سفارش لے کے آئی ہیں جو ملک کی جڑیں کاٹ رہا ہے" میں نے یہ تبدیلی دیکھی کہ اس نے پہلے مجھے تم کہا تھا پھر آپ کہنے لگا۔

"اگر آپ کو معلوم ہے کہ وہ ملک کی جڑیں کاٹ رہا ہے تو آپ اسے پکڑتے کیوں نہیں؟ آپ اس کے ساتھ مل کر ملک کی جڑیں کاٹتے رہتے ہیں۔ کون نہیں جانتا؟ میرے ڈیڈی بھی جانتے ہیں مگر اتنے بڑے ہو کر بھی آپ مجرم ہیں۔ وہ اکیلا مجرم نہیں ہے جس کا بیس لاکھ روپیہ سرحد پہ آ کر ڈوب رہا ہے۔ بات کچھ بھی نہیں۔ آپ نے بتنگڑ بنا دیا ہے"

"آپ کے ڈیڈی کون ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ نہیں بتاؤں گی"

ہماری گفتگو اس طرح تلخ سی سنجیدگی سے شروع ہوئی۔ پھر میں نے بہت سی باتیں کیں اور زیادہ تر باتیں انگریزی میں کیں جس سے وہ مرعوب ہو گیا مگر کام نکلوانے کے لئے یہی اداکاری کافی نہیں تھی۔ وہ عورتوں کا شیدائی تھا۔ اسے یہ تو یقین آ گیا تھا کہ میں پیشہ ور لڑکی نہیں ہوں مگر وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ میں پاکباز بھی نہیں ہوں جو ایک سمگلر کی سفارش کرنے آئی ہوں۔ لہٰذا وہ ڈورے ڈالنے لگا اور میں پلو بچانے کی اداکاری کرنے لگی۔ میں اس کے لئے جوتے شیر بن گئی۔ باتوں باتوں میں وہسکی آ گئی اور تھوڑی دیر بعد ٹیلیفون آ گیا "اسے آنے دو" یہ ٹیلیفون جس شرط پر ہُوا وہ میں نے پوری کر دی مگر ساتھ یہ دھمکی بھی دی۔ "اُس (سمگلر بادشاہ) سے ذکر نہ کرنا، ورنہ وہ تمہیں گولی مروا دے گا"

ملک کا مفاد اس میں تھا کہ اس بڑے افسر کے اعصاب لوہے کی طرح

مضبوط ہوتے اور ایمان لوہے سے زیادہ مضبوط ہوتا مگر ایک لڑکی کے سامنے وہ ریت کی ڈھیری بن گیا۔

اس کامیابی نے میرا حوصلہ اتنا بڑھایا کہ میں نے اسی سمگلر کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے مجھے اپنے گروہ میں بڑی اونچی اور "باعزّت" حیثیت دے دی۔ میری خوراک اور میرے لباس کا اہتمام شاہانہ تھا۔ میں اب ہر رات طرح طرح کے گاہکوں کے ہاتھوں بکنے والی طوائف نہیں تھی۔ بڑے اُونچے رُتبے کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری پارٹیوں کے دعوت نامے آتے تھے۔ میں ایک صاحبِ حیثیت آدمی کی مسز تھی۔ یعنی میرا ایک خاوند بھی تھا برائے نام مگر وہاں میں اکیلی نہیں تھی۔ مجھ جیسی کئی لڑکیاں اور تیس سے پنتیس سال کی عمر تک کی عورتیں مختلف گروہوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہم سب پیشہ ور تھیں مگر مسز فلاں اور مسز فلاں کہلاتی تھیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے۔ لڑکیاں شراب، بدکاری اور شب بیداری سے وقت سے بہت پہلے بوڑھی ہو کر گمنامی میں گم ہوتی جا رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی لڑکیاں آ رہی ہیں۔ میں ایک مدت گزری اس گروہ سے نکل آئی ہوں مگر وہاں کوئی خلا اور کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کسی مجھ سے زیادہ خوبصورت لڑکی نے میری جگہ لے لی ہو گی۔ پاکستان کی سرزمین مجرم خیز ہے!

یہ لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں؟

میں کسی سمگلر کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتی۔ ان لوگوں سے الگ ہوئے بہت عرصہ گزر گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی کسی صوبے کی اسمبلی کا ممبر بن گیا ہو۔ میں آپ کو یہ تفصیلات بھی نہیں سنانا چاہتی کہ سمگلنگ کس طرح ہوتی ہے اور اس میں لڑکیاں کس طرح استعمال کی جاتی ہیں۔ اپنا ایک واقعہ آپ کو سنا دیا ہے، اس کی روشنی میں آپ کے سامنے اس جرم کی واضح تصویر آجانی چاہیے اور یہ تو آپ کو بتا چکی ہوں کہ سمگلنگ اکیلا جرائم پیشہ فرد یا گروہ نہیں کرتا، نہ کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ سرکاری مشینری کے بڑے ہی اہم کل پرزے کام کرتے ہیں۔ کئی بار ایسے ہُوا کہ کوئی سمگلر سامان سمیت پکڑا گیا۔ اسے حوالات میں بھی بند کر دیا گیا مگر کسی وزیر یا کسی بڑے افسر کا فون آ گیا کہ اسے چھوڑ دو۔ لہٰذا سے نہ صرف چھوڑ دیا گیا بلکہ نہایت احترام سے اُسے رخصت کیا گیا اور اس کا سامان جہاں اس نے کہا وہاں پہنچا دیا گیا۔ پولیس کے تھانیدار کسی سمگلر کو ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہی نہیں کرتے۔ ان بے چاروں کو اپنی نوکری کا فکر ہوتا ہے۔

سمگلر کوئی جن بھوت نہیں ہوتے۔ بالکل آپ کی طرح انسان ہوتے ہیں۔ ان کی ساری قوّت اور دولت مجھ جیسی دلکش لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ یہی دو چیزیں پتھر جیسے انسان کو موم کر دیتی ہیں۔ ذرا تصوّر فرمائیں کہ آپ کو گھر بیٹھے ایک حسین لڑکی اور بیس ہزار کا چیک مل جائے تو آپ کیا کریں گے؟ آپ کے ذہن سے دین اور ایمان آپ کو بتائے بغیر نکل جائے گا۔ ذرا اپنے آپ کو اس پوزیشن میں لائیں۔ میں آپ کی بیوی کے لئے عرب کے خالص سونے کا ہار اور آپ کے لئے رولیکس کی تین ہزار روپے کی گھڑی تحفہ لاتی ہوں، اور اپنے ساتھ ہوٹل کے کمرے

میں رات گزارنے کی دعوت دیتی ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ سر کے بل ہو کر مجھے اور میرے تحفوں کو قبول کریں گے۔ وزیر، ان کے محکموں کے سیکرٹری اور افسر پتھر تو نہیں ہوتے۔ سمگلر اُن کی کمزوریوں اور ان کی نفسیات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہی سمگلروں کی قوت ہے۔

میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ سمگلروں کو یہ لڑکیاں کہاں سے ملتی ہیں جو پتھروں کو موم کر دیتی ہیں اور جو طرح طرح کے آدمیوں کے ساتھ ہوٹلوں کے کمروں میں راتیں گزارتی ہیں۔ میں اس سوال کا جواب تفصیل سے دینا چاہتی ہوں کیونکہ اپنی کہانی سنانے سے میرا مقصد ہی یہی ہے کہ والدین اور سوسائٹی کو بتا دوں کہ اصل مجرم وہ نہیں جو جرم کرتے ہیں۔ مجرم وہ ہیں جو مجرم پیدا کرتے ہیں۔ یہ جرم والدین اور سوسائٹی کا ہے۔ قانون شکنی کی زمین دوز دنیا میں ایک تو مجھ جیسی لڑکیاں جاتی ہیں۔ میں نے آپ کو اپنا سارا پس منظر بتا دیا ہے۔ اس پس منظر میں پرورش پانے والی لڑکیاں اعلیٰ قسم کی طوائفیں بنتی ہیں، بلیک میلنگ کے لئے استعمال ہوتی ہیں یا سمگلروں کے گروہوں میں چلی جاتی ہیں یا دشمن ممالک انہیں جاسوسی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان ممالک میں ہندوستان، امریکہ اور روس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ امریکہ کی سی۔ آئی۔ اے میں پاکستانی لڑکیاں کام کر رہی ہیں۔ روس بھی پاکستانی لڑکیوں کو پاکستان میں استعمال کر رہا ہے اور سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ اس قسم کی لڑکیاں ہندوستان کے لئے بھی کام کرتی ہیں۔ پاکستان میں الیکشن میں بھی لڑکیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ سب میری طرح کے پس منظر کی پیداوار ہیں۔

میرے گروہ میں ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اب معلوم نہیں کہاں ہے۔ وہ درمیانہ درجے کے گھرانے کی لڑکی تھی جہاں پردے کی پابندی تھی۔ لڑکی میٹرک پاس تھی۔ والدین نے پچیس ہزار روپیہ نقد لے کر اس کی شادی ساٹھ سال کے ایک بوڑھے کے ساتھ کر دی۔ پردہ نشیں لڑکی کچھ بھی نہ کر سکی۔ بوڑھے ماں باپ کے گھر سے بوڑھے خاوند کے پاس چلی گئی۔ اس بوڑھے کے پاس روپیہ تھا، کار تھی، کوٹھی تھی اور مزاج میں عیاشی تھی مگر جسم میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی ایک

بیوی مر چکی تھی۔ دوسری کو وہ طلاق دے چکا تھا۔ اب آخری عمر میں اٹھارہ سال کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اس لڑکی پر جو گزری اسے وہی بہتر بیان کر سکتی تھی۔ دن بھر تو وہ شہزادی بنی رہتی تھی مگر رات جہنم کی رات ہوتی تھی۔ بوڑھا شراب پی کر ساری رات اس نوجوان لڑکی کو جھنجھوڑتا رہتا۔ لڑکی پھر بھی کنواری رہی۔ اس نے پردے اور شرم کا دامن نہ چھوڑا لیکن وہ نوجوان تھی۔ خون میں شباب کا جوش تھا۔ وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکی۔

اس کے خاوند کے ایک داماد نے اس کے گھر آجانا شروع کر دیا۔ وہ جوان آدمی تھا۔ اس نے لڑکی کو ہاتھ میں کر لیا۔ لڑکی نے شرم و حیا کو خیرباد کہا اور جو پیاس بوڑھا خاوند پیدا کر دیتا تھا، وہ اس کے داماد سے بجھانے لگی۔

راستہ کھل گیا تو لڑکی بھی کھل گئی۔ اس نے پردہ بھی ترک کر دیا اور کار میں باہر نکلنے لگی۔ اُسے چند بار بوڑھے کے داماد نے باہر کی دنیا دکھائی تو لڑکی کے پر کھل گئے۔ اس نے ایک اور آدمی سے آشنائی کر لی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اسی سلسلے میں اسے ایک "چاہنے والا" مل گیا جس نے اس کے ساتھ شادی کرنے کا وعدہ کیا۔ دونوں نے بھاگ چلنے کا پروگرام بنایا۔ لڑکی گھر سے بھاگ کر اس کے ساتھ کراچی چلی گئی۔ خاوند کے خاصے پیسے ساتھ لے گئی تھی۔ کچھ دن انہوں نے کراچی میں خوب عیش کی۔ اس کے "چاہنے والے" نے اسے شراب پلانی بھی شروع کر دی تھی۔ ایک صبح لڑکی جاگی تو اسے پتہ چلا کہ اس کے ساتھ شادی کرنے والا جا چکا ہے۔

اس کے کمرے میں ایک اور خوش پوش اور خوش شکل آدمی آیا۔ اس کی باتوں میں ایسا جادو تھا کہ لڑکی نے اسے نہ دھتکارا اور اس سے ڈری بھی نہیں۔ اس نے لڑکی کو بتایا کہ اس کا دوست اسے دھوکہ دے کر چلا گیا ہے اور اب اگر یہ لڑکی واپس اپنے خاوند کے پاس گئی تو خاوند اسے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اس آدمی نے لڑکی کو بتایا کہ پولیس اسے ڈھونڈ رہی ہے کیونکہ وہ خاوند کو دھوکہ دے کر اور اس کے گھر سے چوری کر کے بھاگی ہے۔

لڑکی بہت ڈری لیکن اس آدمی نے اسے "پناہ" میں لے لیا اور ہوٹل کا بل ادا کر کے اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ لڑکی اُس وقت تک ایسے کئی مردو کے ساتھ دوستی کر چکی تھی۔ اُسے کوئی ڈر نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ اس آدمی نے اس لڑکی کے ساتھ بالکل ویسا ہی سلوک کیا جیسا میرے سمگلر نے میرے سات کیا تھا۔ اس نے لڑکی کے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ رکھی اور اس کے دل قبضہ کر کے اُسے بتایا کہ اس نے اسے اٹھائیس ہزار روپے میں خریدا یہ آدمی سمگلر تھا۔ اس نے لڑکی کو ٹریننگ دے کر اپنے کام میں رواں کر لی میں نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو وہ اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ پتھر سے دُودھ نکال لیتی تھی۔ یہ غریب سے ماں باپ کی شریف اور پردہ نشین بیٹی تھی۔

ایک اور لڑکی ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ اُس کی عمر گیارہ سال ہوئی تو اُ کی ماں مر گئی۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی تھا۔ اس کا باپ اچھا بھلا آدمی تھ لیکن بیوی کے مرنے کے ایک سال بعد اس نے دوسری شادی کر لی۔ دوس بیوی کو طلاق ملی ہوئی تھی۔ اس نے گھر میں آتے ہی گیارہ سال کی بچی کو نوکرا کا درجہ دے دیا۔ وہ خوبصورت اور چالاک عورت تھی۔ اس نے خاوند پر اپ جادو چلا لیا اور اس کے بچوں کے خلاف اس کے کان بھرنے لگی۔ وہی باپ ج کے دل میں اپنے بچوں کا پیار تھا، بچوں کو مارنے پیٹنے لگا۔ ڈیڑھ دو سال سوتیلی ماں کا اپنا بچہ پیدا ہوا۔ سوتیلے بچوں کی اہمیت بالکل ختم ہو گئی۔ سوتی بچی پہلے ہی نوکرانی بنی ہوئی تھی۔ نئے بچے کے آجانے سے اس کی راتیں بھی نوکری میں گزرنے لگیں۔ پھر ماں نے بچے کو بوتل سے دُودھ پلانا شرو کر دیا اور بچہ اس لڑکی کے حوالے کر دیا۔ رات کو بچہ روتا تھا تو یہ لڑکی جاگ کر اسے دُودھ پلاتی تھی۔ وہ بھی آخر بچی ہی تھی۔ بعض اوقات بچہ روتا تو ا کی آنکھ نہ کھلتی۔ اس صورت میں باپ یا سوتیلی ماں اُٹھ کر اسے دو چار تھپ مار کر اور گھسیٹ کر اُٹھاتے تھے۔

یہی حشر اس لڑکی کے چھوٹے بھائی کا ہوتا تھا۔ ان دونوں نے گھر میں پیار اور روحانی سکون دیکھا تھا۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ نفرت اور پھٹکار ک

ہوتی ہے مگر اب گھر میں ان کے لئے نفرت اور پھٹکار رہ گئی اور پیار اور روحانی سکون خواب بن گیا۔ وہی باپ جسے وہ دنیا کا سب سے زیادہ پیارا انسان سمجھتے تھے ان کا دشمن بن گیا۔ سوتیلی ماں الگ مارتی پیٹتی اور شام کے بعد باپ گھر آتا تو اس سے الگ پٹائی کراتی۔ دونوں بچے پیار اور شفقت ڈھونڈتے تھے مگر باپ کے پیار کا دھارا ان کی سوتیلی ماں کے بچوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ پانچ برسوں میں سوتیلی ماں کے دو بچے پیدا ہوئے۔ اُس وقت یہ لڑکی اٹھارہ انیس سال کی ہو چکی تھی اور اس کے چھوٹے بھائی کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ بھائی تو مرد تھا۔ باہر نکل جاتا تھا اور دل بہلا لیتا تھا۔ مشکل لڑکی کے لئے تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے گھر میں قید رہتی تھی۔ اسے گھر کے در و دیوار سے نفرت ہو گئی تھی۔

لڑکا بارہ تیرہ سال کی عمر میں آوارہ ہو گیا تھا۔ اس نے سکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ گھر سے بھاگ گیا۔ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ لڑکی نے تیرہ سال کی عمر میں پیار کا ذریعہ پیدا کر لیا تھا۔ یہ اس کے پڑوس کا ایک لڑکا تھا جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ دوپہر کے وقت جب سوتیلی ماں کمرے میں سو جاتی تھی تو لڑکی چھت پر چلی جاتی۔ یہ لڑکا ساتھ والے مکان میں رہتا تھا۔ وہ اپنی چھت پر آ کر اس طرف آجاتا۔ چھت پر بند برساتی بنی ہوئی تھی۔ وہاں وہ محبت کا کھیل کھیلتے اور میاں بیوی بن جاتے۔ لڑکی کو تھوڑی سی دیر کے لئے عجیب سی لذّت ملتی۔ سوتیلی ماں کے جہنم میں اس لڑکے کے ساتھ جنسی کھیل کھیل کر وہ اس جہنم کی اذیت کو بھول جاتی تھی۔ پھر وہ بڑی ہو گئی۔ وہ لڑکا بھی جوان ہو گیا۔ اب وہ کوٹھے کی برساتی پر نہیں مل سکتے تھے۔ اپنے اپنے کوٹھے پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔

باپ نے لڑکی کی شادی کی بات کی تو سوتیلی ماں نے مخالفت کی اور دلیل یہ دی کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے۔ اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کو وہ چھوٹی صرف اس لئے کہہ رہی تھی کہ گھر کا سارا کام کاج اس لڑکی نے سنبھال رکھا تھا۔ سوتیلی ماں نے لڑکی کو پیار سے اپنا ہم خیال بنانے کی بجائے لڑکی پر تشدّد پہلے سے زیادہ کر دیا۔ لڑکی اب جوان ہو چکی تھی۔ اس نے سوتیلی ماں کو اینٹ کا

جواب پتھر سے دینا شروع کر دیا۔ سوتیلی ماں نے لڑکی کے باپ سے شکایت کی۔ باپ نے پہلے کی طرح لڑکی کو گالیاں دیں۔ لڑکی نے باپ کو بھی کھری کھری سنا ڈالیں اور اسے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تم زن مرید ہو۔ باپ اسے مارنے کے لیے دَوڑا تو لڑکی نے جلانے والی لکڑی اٹھا لی۔ باپ بُت بن کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کی بیٹی اس کے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔ اسے یہ تو احساس ہی نہیں تھا کہ اپنی بیٹی کو پیار اور شفقت سے محروم کر کے اور اسے سوتیلی ماں سے پٹوا پٹوا کر اس کے اندر انتقام کی اتنی آگ بھر دی ہے جس پر اب لڑکی قابو نہیں پا سکتی۔ سوتیلی ماں بھی دبک گئی۔ لڑکی دلیر ہو گئی مگر وہ یہ بھی جان گئی کہ اب اس گھر میں رہنا ممکن نہیں رہا۔ اس نے ایک روز اسی لڑکے کو چھت پر بلایا جس کے ساتھ اس نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں بہت دن میاں بیوی کا کھیل کھیلا تھا۔ وہ بھی اَب جوان تھا۔ اس کے ساتھ اس نے از سرِ نو عشق و محبت کا کھیل شروع کر دیا۔

گھر میں لڑکی نے کام کاج چھوڑ دیا۔ سوتیلی ماں کے ساتھ ذرا ذرا سی باتوں پر لڑائی جھگڑا ہوتا تھا۔ لڑکی نے باہر جانا شروع کر دیا۔ اس کا پڑوسی باہر کہیں انتظار میں کھڑا رہتا تھا۔ اس نے لڑکی کو پکچریں دکھائیں۔ اسے گھمایا پھرایا اور خوب خراب کیا۔ وہاں اور بھی شکاری موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اتنی حسین لڑکی اتنی آزادی سے گھومتی پھرتی ہے۔ انہوں نے جال پھینکے تو لڑکی پھنس گئی۔ لڑکی کا کوئی کردار تو تھا ہی نہیں۔ اس نے اٹھارہ انیس سال پنجرے میں گزارے تھے جہاں اس کے لیے نفرت اور پھٹکار تھی۔ وہ کھویا ہُوا پیار ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی عقل پر مجروح جذبات کا قبضہ تھا۔ وہ جنسی آسودگی کو پیار سمجھتی تھی۔ آخر ایک روز وہ دوستیاں بدلتے بدلتے اسی زمین دوز دُنیا میں آ گئی جہاں آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ آپ ان کہانیوں سے اُکتا گئے ہیں۔ ایسی کہانیاں آپ سینکڑوں بار پڑھ چکے ہوں گے۔ افسانہ نویسوں نے ایسے ہزاروں افسانے لکھے ہیں۔ آپ نے بھی لکھے ہوں گے مگر افسانہ نویس چونکہ گھر بیٹھ کر لکھتے ہیں،

اس لیے انہیں علم نہیں ہوتا کہ ان کہانیوں کے کردار کہاں جا کر گم ہو جاتے ہیں۔ میں آپ کو ان کہانیوں کے انجام کے بعد کی باتیں سنا رہی ہوں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ پاکستان میں سب سے پہلے کراچی کا چکلا بند کیا گیا تھا۔ عصمت فروشی کا بازار پاکستان کا سب سے بڑا بازار تھا۔ وہاں ہر معیار کی طوائف مل جاتی تھی، اَن پڑھ اور اُجڈ بھی اور گریجویٹ بھی۔ آپ شاید یقین نہ کریں، لیکن اس حقیقت کو میں جھٹلا نہیں سکتی کہ بعض مہذّب گھرانوں کی لڑکیاں صرف پیسے کمانے کی خاطر یہاں پارٹ ٹائم عصمت فروشی کرتی تھیں۔ ٹھیکیدار یعنی دلال کے ساتھ ان کی شرط یہ ہوتی تھی کہ گاہک شائستہ اور امیر ہو۔ یہ چکلا بند کر دیا گیا۔ عصمت فروش مخلوق سارے شہر میں پھیل گئی اور یہی کاروبار گلی محلوں میں شروع ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد لاہور کی ہیرا منڈی بھی اس کاروبار کے لیے بند کر دی گئی۔ وہاں بھی بدکار عورتیں سارے شہر میں پھیل گئیں۔ ان میں اکثر طوائفیں اتنی شائستہ تھیں کہ کئی محلوں میں جہاں انہوں نے جا کر رہائش اختیار کی، ان کے متعلق کسی کو وہم و گمان تک نہ ہُوا کہ یہ کاروباری عورتیں ہیں۔ ان میں جوان لڑکیاں بھی تھیں اور ان میں تعلیم یافتہ بھی تھیں۔ انہوں نے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کو سہیلیاں بنا کر انہیں اپنے راستے پر چلا لیا اور عصمت فروشی کے کاروبار میں خوب اضافہ کیا۔

میرے گروہ کی ایک لڑکی کا قصّہ چار دیواری کی دنیا کا ایک اور مسئلہ ہے۔ یہ لڑکی مستریوں ترکھانوں کے خاندان کی تھی۔ اس کے والدین نے اپنا معیار برادری میں بلند کرنے کے لیے لڑکی کو بی اے تک تعلیم دلائی۔ شادی کا وقت آیا تو ماں باپ نے برادری کے رشتے یہ کہہ کر ٹھکرا دیئے کہ لڑکی گریجویٹ ہے، معمولی گھرانے میں رشتہ نہیں دیں گے۔ انہوں نے برادری سے باہر اچھے اور کھاتے پیتے گھرانے میں رشتہ دینے کی کوشش کی تو جواب ملا کہ ہم ترکھانوں کے گھر کی لڑکی قبول نہیں کریں گے۔ برادری نے اس گھرانے کا بائیکاٹ کر دیا۔ لڑکی گریجویٹ تھی مگر ذہن چھوٹا اور تنگ تھا۔ لہٰذا وہ عام لوگوں کے ساتھ بات بھی نہیں کرتی تھی، وہ فیشن کو اور مصنوعی طور طریقوں اور انداز کو اونچے معیار

کی نشانی سمجھتی تھی۔ اس نے کالج کی سہیلیوں سے میل ملاقات جاری رکھی۔ ان میں امیر گھرانوں کی لڑکیاں بھی تھیں۔ اور ان میں مجھ جیسی لڑکیاں بھی تھیں۔ ان لڑکیوں کے دوست تھے اور دوستوں کی کاریں بھی تھیں۔

لڑکی کو کار کی پہلی لفٹ ملی تو اس کا دماغ آسمان پر جا پہنچا۔ ایک شہزادے نے اُسے اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں دعوت دی تو اس کی آنکھوں اور عقل پر پردہ پڑ گیا۔ اس کے والدین اسی پہ پھولے نہ سماتے تھے کہ ان کی بیٹی ماڈرن ہو گئی ہے۔ اب تو وہ برادری میں لڑکی کا رشتہ دینے کی سوچتے بھی نہیں تھے اور وہ یہ بھی نہ سوچ سکے کہ جوان لڑکی شام کو کہاں چلی جاتی ہے۔ لڑکی اسی راستے پر چل پڑی تھی جس پر میں گزر رہی ہوں۔ یہ راستہ لڑکی کو میری طرح مہذب عصمت فروشی سے سمگلنگ تک لے گیا۔

فلموں کا شوق اور فلمی گانوں کا نشہ فلم سٹوڈیو کے راستے بہت سی لڑکیوں کو کوٹھے تک پہنچا چکا ہے۔ ان میں سے جو تیز طرار نکلتی ہے، وہ سمگلروں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

ایک اور لڑکی کے متعلق آپ کو بتاؤں۔ اس سے آپ کو کئی گھرانوں کی جھلک نظر آئے گی۔ اس لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے ماں باپ کو آپس میں لڑتے دیکھا۔ یہ ان کی پہلی بچی تھی۔ بعض اوقات ماں اور باپ وہ غصہ جو انہیں ایک دوسرے پر ہوتا تھا اس بچی پر نکال دیتے تھے۔ ان کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ان کے لڑائی جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ بچی کا باپ شادی کسی اور جگہ کرنا چاہتا تھا لیکن والدین نے اپنی مرضی کے مطابق کرا دی۔ اس نے لڑکی کی ماں کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دی۔ بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کر دیا۔ لڑکی کو ماں باپ کا پیار ملا ہی نہیں تھا۔ وہ بڑی ہوتی تو زیادہ دیر باہر رہنے ہی کی کوشش کرتی۔ باپ کی تنخواہ اچھی تھی۔ لڑکی کو کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ لڑکی سے چھوٹے تین اور بچے بھی پیدا ہوتے۔ عجیب صورت ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے دشمن ہیں لیکن بچے بھی پیدا کر رہے ہیں۔

کالج میں لڑکی کو ایک سہیلی مل گئی اور وہ کبھی کبھار اس کے گھر چلی جاتی۔ وہاں اس نے دیکھا کہ اس کی سہیلی کا باپ ہنس مکھ تھا اور گھر میں پُر لطف سا سکون اور رونق تھی۔ سارا کنبہ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ یہ لڑکی اس گھر میں جاتی تو اسے سکون بھی ملتا اور اسے دُکھ بھی ہوتا کہ اس کا گھر اس طرح پُرسکون نہیں۔ اپنے باپ کی بجائے وہ سہیلی کے باپ کو پسند کرنے لگی۔ وہ کہتی ہے یہ شخص ہر بات لطیفے کے رنگ میں کرتا تھا۔ لڑکی تھرڈ ائیر میں پہنچی تو اُس وقت تک سہیلی کے گھر کا پیار اس کی روح میں اُتر چکا تھا۔ ایک روز اس کی سہیلی کالج نہ آئی تو چھٹی کے بعد وہ اس کے گھر چلی گئی۔ سہیلی کا باپ گھر میں اکیلا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا سارا کنبہ تین چار دنوں کے لئے ملتان چلا گیا ہے۔

لڑکی سہیلی کے باپ کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اس باپ کو اپنے گھر کا حال سنایا اور وہ رو پڑی۔ لڑکی خوبصورت تھی اور پیار کی پیاسی۔ سہیلی کے باپ نے پہلے تو اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا، پھر اسے اپنے ساتھ لگایا اور پھر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ لڑکی اس آدمی کی گرویدہ تھی۔ اس نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے اس وقت بھی بُرا نہ منایا جب سہیلی کے باپ نے پہلے اس کے گالوں کو چُوما پھر ہونٹ اس کے ہونٹوں سے لگا دیئے۔ لڑکی نے مجھے بتایا تھا کہ اسے اپنے باپ نے بچپن میں کبھی نہیں چُوما تھا۔ اس کی سہیلی کے باپ نے اسے چُوما تو اسے اپنے باپ کا خیال آیا۔ اس سے اسے نفرت ہونے لگی اور سہیلی کا باپ اسے اور زیادہ اچھا لگنے لگا۔

وہ شگفتہ مزاج آدمی تھا یہی اس کی کشش تھی۔ اس نے پیار پیار میں اور ہنستے کھیلتے لڑکی کو اپنے پاس لٹا لیا۔ پھر لڑکی بھول گئی کہ یہ آدمی اس کے باپ کی عمر کا ہے اور وہ بھی یہ بات بھول گیا کہ یہ لڑکی اس کی بیٹی کی ہم عمر اور ہم جماعت ہے۔ لڑکی نے ایسی لذت محسوس کی کہ اس پر نشہ طاری ہو گیا۔ گھر کے تلخ اور دوزخی ماحول سے بھاگی ہوئی لڑکی نے ذرہ بھر دھیان نہ دیا کہ یہ گناہ ہے۔ اس کی سہیلی اپنے سارے کنبے کے ساتھ تین دن ملتان رہی۔ یہ لڑکی تین دن چھٹی کے بعد اس کے باپ کے پاس جاتی رہی اور یہی کھیل کھیلتی رہی۔ پھر اس

کی سہیلی آگئی۔ اب یہ لڑکی اس کے باپ سے تنہائی میں نہیں مل سکتی تھی۔ اس نے محلّے کے ایک لڑکے کے ساتھ تعلقات پیدا کر لئے۔ یہاں سے دوستیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور وہ ایک روز ایک دوست کے ساتھ فلم سٹوڈیو میں چلی گئی۔ فلمی دنیا کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں نے اسے طوائف بنا کے چھوڑا اور وہ سمگلروں کی دنیا میں پہنچ گئی۔ تھرڈ ایئر پاس کر چکی تھی۔ تعلیم نے اس کی خوبصورتی کے ساتھ مل کر اس میں وہ اوصاف پیدا کر دیئے جن کی سمگلروں کو ضرورت ہوتی ہے

اس لڑکی کو سیاسی بلیک میلنگ کے لئے بہت استعمال کیا گیا تھا۔ اسے ایک روز ایوب خاں کے دَور کے ایک وزیر کے پاس بھیجا گیا تھا۔ وہ دو دن اور دو راتیں اس کے پاس رہی تھی۔ واپس آئی تو اس نے بتایا کہ اس وزیر نے اسے امریکہ کی سی۔ آئی۔ اے کے لئے کام کرنے کی پیش کش کی تھی اور اسے بہت اکسایا تھا اور اسے یہاں تک کہا تھا کہ اسے امریکہ کی سیر کے لئے بھیجا جائے گا لیکن یہ لڑکی نہیں مانی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس نے ایسی دلکش پیش کش ٹھکرا دی ہو گی۔ چھ مہینوں بعد یہ لڑکی مجھے پھر کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

یہ صرف میرے گروہ کی چند ایک لڑکیاں تھیں۔ میں اپنی کوئی رائے نہیں دیتی۔ آپ کو ان لڑکیوں کے پس منظر بتا دیتے ہیں۔ پڑھنے والے خود ہی رائے قائم کر لیں گے کہ زمین دوز دنیا میں لڑکیوں کو پہنچانے والا کون ہے اور یہ لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں۔ میں صرف یہ رائے دوں گی کہ یہ لڑکیاں نارمل ذہن کی نہیں ہوتیں۔ یہ ابنارمل گھرانوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ ان میں وہ لڑکیاں تو بہت ہی بدقسمت ہوتی ہیں جنہیں خدا غیر ذمہ دار اور ابنارمل والدین کے گھر پیدا کر کے انہیں حُسن بھی دے دیتا ہے۔ یہ لڑکیاں جب گھر سے نکلتی ہیں تو سوسائٹی انہیں مکمل طور پر بے حیا بنا دیتی ہے۔ ان کا کوئی باپ نہیں ہوتا، کوئی بھائی نہیں ہوتا۔ ان کی خوبصورتی اور ان کی جوانی انہیں تباہی کے غار تک پہنچا کر دم لیتی ہے۔

ماضی میرے سامنے آگیا

میں آپ سے معافی چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے کہانی سُننے آتے تھے اور میں نے فلسفہ بگھارنا شروع کر دیا ہے۔ کہانی سنانے کا مقصد پہلے بھی بتا چکی ہوں، ایک بار پھر واضح کر دیتی ہوں کہ میں اپنے آپ کو عبرت کے طور پر پیش کر رہی ہوں۔ والدین سے اور سوسائٹی کے بزرگوں سے اور حکومت سے کہیں کہ میں اُن جگہوں کی نشاندہی کر رہی ہوں جہاں مجرم پیدا ہوتے ہیں۔ ایک دو سمگلر اور عصمت فروشوں کو پکڑ کر آپ اس غلاظت سے ملک کو پاک نہیں کر سکتے۔ اس سرچشمے کو بند کریں جہاں سے یہ غلاظت اُمڈ اُمڈ کر پھیل رہی ہے۔

میں سمگلروں کے اس گروہ کے ساتھ دو سال رہی اور شہزادیوں کی طرح رہی۔ میرا ایک برائے نام خاوند تھا۔ کار تھی اور کوٹھی تھی۔ وزیروں کی محفلوں میں اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ سمگلنگ زور و شور سے اور پوری آزادی سے ہوتی تھی۔ بلیک میلنگ ہوتی تھی۔ ہمارے لئے کوئی سرحد نہیں تھی۔ کوئی قانون نہیں تھا۔ قانون کے محافظ ہماری مُٹھی میں تھے۔ عورت شراب اور دولت نے حکمرانوں کو مجبور اور بے بس کر رکھا تھا۔ وہی وزیر جو سمگلروں کی پشت پناہی کرتے تھے، جہاں جاتے اس قسم کی ہی تقریر کرتے تھے کہ سمگلنگ کا قلع قمع کر دیا جائے گا۔ آپ اخباروں میں کبھی کبھی یہ خبر پڑھا کرتے ہیں کہ اتنی افیون اور چرس پکڑی گئی ہے اور سمگلروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ چھوٹے درجے کے سمگلر ہوتے ہیں جو بڑے سمگلروں کی طرح متعلقہ سرکاری محکموں کو باقاعدہ خوش رکھنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ کبھی پکڑے جائیں تو رشوت پیش کرتے ہیں۔ پکڑے جانے کی صورت میں رشوت زیادہ بلکہ بہت زیادہ طلب کی جاتی ہے۔ یہ رقم اتنی زیادہ ہوتی

ہے جو سمگلر دے نہیں سکتے اور گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات پولیس اپنی کارکردگی کی تشہیر کے لئے بھی کسی بے وسیلہ سمگلر کو پکڑ لیتی ہے اور اس کارنامے کی خبریں تمام اخباروں میں چھپوائی جاتی ہیں۔ اونچے درجے کے سمگلروں کو پکڑنے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔

میں تھک گئی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں نے اپنے سمگلر بادشاہ سے ذکر کیا تو اس نے مجھے ڈیڑھ ایک مہینے کے لئے مری چلے جانے کا مشورہ دیا۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ میرا جو برائے نام خاوند تھا وہ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ میں نے اسے دھتکار کر کہا کہ تم میرے سچ مچ کے خاوند بن بیٹھے ہو۔ یہیں رہو اور میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اکیلی مری چلی گئی۔ اپنے آپ کو برقعے میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے اُسی ہوٹل میں قیام کیا جہاں سے میں نے اس کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ منیجر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہُوا۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ دن آرام کرنے آئی ہوں اس لئے کسی کے ساتھ میرا تعارف نہ کرائے۔ اس نے مجھے کمرہ بلا اُجرت پیش کیا جو میں نے قبول کر لیا۔

اتنے لمبے عرصے بعد مجھے فراغت نصیب ہوئی تھی۔ میں ایسی عورت بن چکی تھی جس کے اندر کوئی جذبات نہیں تھے۔ احساسات بھی مر گئے مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ میں نے پہلے روز ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی کھولی تو یوں لگا جیسے

میرے ماضی کے کواڑ کھل گئے ہوں۔ پہلی بار میں مری آئی تھی تو زمین کا یہ خطہ مجھے جنت کی طرح حسین نظر آیا تھا۔ اس نے مجھے طلسم ہوش ربا کی طرح مسحور کر لیا تھا اور میں نے چاہا تھا کہ مری کے سبزہ زار میں اور بادلوں کے اُڑتے ہوئے گالوں میں اپنے آپ کو گم کر دوں۔ اُس وقت مجھ پر محبت کا بھی سحر طاری تھا۔ میرے ساتھ وہ آدمی تھا جسے میں نے چاہا تھا اور جسے میں نے دل ہی دل میں ساری عمر کا رفیق بنا لیا تھا مگر سحر بڑی ہی بے رحمی سے توڑ دیا گیا تھا۔ جسے میں نے منزل سمجھا تھا وہ سراب نکلا۔ اب میں نے کھڑکی کھولی تو مری کا وہی حُسن مجھے زہر آلود لگا۔ چیل اور دیودار کے لمبے لمبے پیڑ بھوتوں کی طرح دکھائی دینے لگے۔ چار پانچ پیڑ میری کھڑکی کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان میں سے ہوا کے جھونکے گزرتے تھے

تو سائیں سائیں کی ایسی آواز آتی تھی جیسے یہ پیڑ اور ہوا میری محبت کی موت پر سسکیاں لے لے کے رو رہی ہو۔ تین چار سال پہلے یہی آوازیں تھیں جن میں مجھے آسمانوں کی موسیقی سنائی دی تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ یہ میرے آنسوؤں کی دھند تھی۔ میں نے آنسو پونچھے نہیں۔ کھڑکی میں کہنیاں ٹیک کر مری کی خنکی کو محسوس کرتی رہی اور میرا ذہن مجھے ماضی میں بہت دُور پیچھے لے گیا۔ لمحوں کا کارواں پیچھے کو چل پڑا اور مجھے مشرقی پنجاب کے اُس سکول میں لے گیا جسے دیکھ کر بھی کوئی نہیں کہتا تھا کہ یہ سکول ہے۔ میں نے اُس عمر میں اس کچے سے کوٹھے کی عظمت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ میں بچی تھی وہاں اُردو اور قرآن پڑھتی تھی۔ بچپن کی اس یاد میں جانے کیسا جادو تھا کہ اعلیٰ قسم کے اس ہوٹل کے اتنے اچھے کمرے میں جہاں صرف دولت والے ہی قیام کر سکتے تھے، میرا دم گھٹنے لگا۔ میں یہاں سے بھاگ کر اُس کچے کوٹھے میں جا پناہ لینے کو بے تاب ہونے لگی۔ مجھے اس کی عظمت کا احساس اب ہُوا جب میں سب کچھ کھو بیٹھی تھی اور اس سراب کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اتنی دُور نکل آئی تھی جہاں سے میں واپس نہیں جا سکتی تھی۔

مجھے پاکستان کا گھر یاد آیا۔ گھر کے سارے فرد یاد آتے۔ والد صاحب کی یاد نے تو تڑپا دیا۔ میری تباہی میں ان کا بھی ہاتھ تھا مگر میرے بھائیوں نے جب کل پُرزے نکالے تو والد صاحب کی گھر میں کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ مجھے وہ ماں بھی یاد آئی جس کی کوکھ سے میں ایک پاک صاف اور آسمان کے پانیوں میں دُھلی ہوئی پیدا ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ پاکیزہ بچی بڑی ہو کر سارے معاشرے کو ناپاک کرے گی اور گناہوں کی بڑی ہی خوبصورت علامت بن کر اور گھر سے بھاگ کر خاندان کو ذلت و رسوائی میں ڈالے گی۔ پھر مجھے اپنا بچہ یاد آیا اور مجھے اس کا رونا بھی یاد آیا۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ میری کیا حالت ہوئی۔ اس سے پہلے یہ بچہ مجھے مری میں ہی یاد آیا تھا اور جی میں آئی تھی کہ عیسائیوں کے اُس ہسپتال میں چلی جاؤں اور اپنے بچے کا سراغ لگا کر اسے اٹھا لاؤں اور کہیں دُور نکل جاؤں۔ اب پھر دل

میں یہی خواہش تڑپی جس نے مجھے تڑپا کے رکھ دیا۔

بچہ یاد آتے ہی میرے جذبات اور احساسات شعلوں کی طرح بھڑک اُٹھے۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میری کوئی ایک بھی حس نہیں مری اور میرے سینے میں وہ عورت زندہ ہے جو محبت کی پیاسی ہے۔ مجھے بڑی تلخ تشنگی کا اور اپنے آپ میں ایک مہیب خلا کا احساس ہُوا۔ یہ احساس نزع کے وقت کی تلخی بن گیا۔ میں اس قدر پریشان اور بے حال ہوئی کہ کھڑکی سے ہٹ کر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔ ہوٹل کے ایکسچینج سے ہوٹل کا ہی مطلوبہ نمبر لیا اور کہا کہ چار پیگ سکاچ وہسکی اور سوڈا میرے کمرے میں بھیج دو۔ میں اپنے ماضی کو شراب میں ڈبو دینا چاہتی تھی۔ ان تلخیوں کا اور علاج بھی کیا تھا۔

مگر وہسکی کے چار پیگ حلق سے اُترے تو یوں لگا جیسے میں نے سینے کی آگ پر تیل ڈال دیا ہو۔ ماضی اور زیادہ نکھر کر سامنے آگیا۔ میرے ذہن میں بچہ زور زور سے رونے لگا۔ مجھے اپنی چھاتیوں میں اینٹھن سی محسوس ہوئی۔ مجھے بالکل علم نہیں کہ ماں کی چھاتیوں میں جب دُودھ اُترتا ہے تو وہ اینٹھن محسوس کرتی ہے یا نہیں اور بچے کو دُودھ پلا کر وہ کیا محسوس کرتی ہے، اور جن ماؤں کے بچے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں، اُن کا دُودھ اُترتا ہے تو دُودھ کی تکلیف کے علاوہ ان کے دل کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ میرا بھی دُودھ اُترا تھا لیکن صرف تین چار دن۔ میں نے دوائیوں سے دُودھ خشک کر لیا تھا مگر اب اس کمرے میں بیٹھے جب مجھے چھاتیوں میں اینٹھن سی محسوس ہوئی تو میں سمجھ نہ سکی کہ یہ دُودھ کا جوش ہے یا جذبات کے خون کا جوش۔ یہ جو کچھ بھی تھا اس نے میرے بچے کو سامنے لا کھڑا کیا۔ میں نے بچے کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کا صرف رونا سُنا تھا اور میں نے نرس سے کہا تھا کہ اسے لے جاؤ۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی اور نرس بچے کو لے گئی تھی۔

بچہ مجھے اتنی شدت سے کبھی یاد نہیں آیا تھا کہ مجھے اپنی انگیہ بھیگتی ہوئی محسوس ہو مگر اُس روز میرے جذبات اسی ایک خواہش پر تڑپنے لگے کہ میرا بچہ ہو اور میں اُسے دُودھ پلاؤں۔ یہ فطری خواہش تھی۔ جنسی آسودگی یا آوارگی

فطرت کے سارے تقاضے پورے نہیں کر سکتی۔ عورت فطرت کے اس تقاضے کو دبا نہیں سکتی کہ اس کا بچہ ہو۔ میں نے اس تقاضے کی شدت کو محسوس کیا اور اسے دبانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن تلخی بڑھتی گئی اور یہاں تک بڑھی کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ کسی اپنی پسند کے آدمی کو کمرے میں لے آؤں اور اسے کہوں کہ مجھے ایک بچہ چاہیے مگر میرے پیشے کے حقائق ایسے تھے جو بچے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کوئی ایسا آدمی بھی مجھے نہیں مل سکتا تھا جو میرے ساتھ شادی کر لیتا۔ تاہم فطرت کا یہ خلا جو پُر ہوتا نظر نہیں آتا تھا، مجھے پریشان کرنے لگا۔ میں نے وہسکی کے تین اور پیگ منگوائے۔ یہ بھی اس خلا میں بہہ گئے۔ آخر ہوٹل کے منیجر کے پاس گئی اور اس سے امریکی گانجا (ماریجوآنا) لے کر اپنے آپ کو بیہوش کر دیا۔

میری آنکھ کھلی تو اگلے روز کے دس بج رہے تھے۔ سر بوجھل تھا۔ دل پر گھبراہٹ تھی۔ میں غسل خانے میں چلی گئی۔ جسم پر بے شمار پانی پھینکا مگر طبیعت سنبھل نہ سکی۔ تنہائی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ایسے ساتھی کی ضرورت جو کاروباری نہ ہو اور جو میری تشنگی اور میرے جذبات کو سمجھ سکے۔ محبت کے بغیر کون زندہ رہ سکتا ہے۔ میں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ واپس چلی جاؤں اور اپنے پیشے میں مگن ہو جاؤں۔ وہاں میرے جذبات کبھی یوں نہیں بھڑکے تھے۔ کبھی بچہ یاد نہیں آیا تھا۔ گناہ کی راتیں اور گناہ کے دن میری فطرت کا خلا پُر کئے رکھتے تھے۔ میں نے یہ ارادہ یہ سوچ کر ملتوی کر دیا کہ چند دن مری میں رہوں گی۔ اگر جذباتی حالت نہ سنبھلی تو چلی جاؤں گی۔

کاش، وہ مجھے نہ ملتا

دو رونہ لبعد کا واقعہ ہے۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں برقعہ اوڑھے، خراماں خراماں مال روڈ کی طرف نکل گئی۔ بھیڑ کوئی ایسی زیادہ تو نہیں تھی لیکن یہ تھوڑے سے لوگ ہجوم کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکیاں اور لڑکے کپڑوں کی، بالوں کی اور فیشن کی نمائش کرتے پھر رہے تھے۔ یہ سب مجھے خالی خالی سے لوگ لگے، بے مقصد جینے والے لوگ۔ میں برقعے میں تھی۔ ایک نقاب اُوپر تھا اور دوسرے سے میں نے ٹھوڑی اور ناک کو چھپا رکھا تھا۔ آنکھیں اور پیشانی ننگی تھی۔ پیشانی پر چند ایک بھورے بھورے بال بکھرے ہوتے تھے۔ میں نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ برقعے میں میرا آدھا چھپا ہُوا چہرہ زیادہ دلکش لگتا ہے۔ میں مال روڈ پر گھومتے پھرتے لوگوں کی بھوکی بھوکی نظروں کو نظر انداز کرتی پوسٹ آفس والے چوک سے بھی آگے نکل گئی۔ ذرا آگے جاکر جو راستہ نیچے کو جاتا ہے، اس پر اُترنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ گھوم کر دیکھا۔ میری عمر کا ایک نوجوان آرہا تھا۔

وہ میرے قریب سے گزر گیا۔ اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

میں نے اسے بڑی اچھی طرح دیکھا۔ اس کے بھرے بھرے تندرست چہرے پر معصومیت کا جو تاثر تھا وہ مجھے کچھ اچھا لگا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بڑی پیاری سی اور مردانہ سی چمک تھی۔ اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ اگر اس کے بال بڑھے ہوتے تو میں اس کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کرتی۔ اس کا جسم پھرتیلا، گٹھا ہُوا اور جاذبِ نظر تھا اور اس کی چال میں تمکنت اور مردانگی

تھی۔ مری میں مجھے یہ ایک ہی نوجوان نظر آیا تھا جس کے بال سلیقے سے کٹے ہوتے تھے اور جو مال روڈ کی رونق کو چھوڑ کر اُس طرف نیچے چلا جا رہا تھا جہاں کوئی رونق نہیں ہوتی۔ وہاں مصنوعی حُسن نہیں ہوتا۔ وہاں قدرت کا حُسن ہے۔ تنہائی ہے مگر وہاں جا کر ساتھی کی خواہش شدید ہو جاتی ہے۔

وہ آگے نکل گیا۔ میں آہستہ آہستہ اُترتی گئی اور اُس جگہ پہنچ گئی جہاں تھوڑا سا میدان ہے، پتھر کے بنچ ہیں اور لمبے لمبے درختوں کے جُھنڈ کھڑے ہیں۔ میں وہاں ٹہلنے لگی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس طرف چلا گیا ہے۔ وہ اچانک ایک طرف سے نمودار ہُوا۔ اُس نے مجھے دیکھا اور میں نے اُسے دیکھا میرے جذبات اُبلے ہوئے تھے۔ تنہائی مجھے کھا رہی تھی۔ یقین کیجئے کہ اُسے دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میرا بچہ بڑا ہو کر اسی کی طرح جوان اور خوبرو ہو گا۔ وہ مجھے اپنے بچے کی طرح معصوم اور بھولا بھالا لگا۔ اس کے چہرے مہرے پر کوئی ایسا تاثر تھا جو اس کی عمر کے جوان آدمیوں کے چہرے پر کم ہی نظر آیا کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھ پر جو تنہائی کا اثر تھا یہ اس کا فتور ہو کہ اپنی طرح ایک آدمی کو تنہا پھرتے دیکھا تو وہ مجھے اچھا لگا۔

وہ سامنے سے میری طرف آ رہا تھا اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے جیسے اُس کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا تھا یا شاید میں مسکراتی تھی اور یہ مسکراہٹ اُسے برقعے کے باریک نقاب میں سے نظر آ گئی تھی۔ کچھ ہُوا ضرور تھا۔ میں کوئی شریف لڑکی تو نہیں تھی۔ مجھ میں حیا اور شرم تو رہی نہیں تھی مردوں کو مسکراہٹوں پر نچا دینا تو میرا پیشہ تھا۔ تاہم اگر میں مسکرائی تھی تو یہ مسکراہٹ کاروباری نہیں تھی — اس میں پیار کی تشنگی تھی، اور اس مسکراہٹ میں کوئی مسرت نہیں تھی۔ وہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے دھیمی سی آواز میں پوچھا "کسی کا انتظار ہے یا اکیلی سیر کو نکلی ہیں؟"

میں رُک گئی اور جواب دیا "اکیلی ہی نکل آئی ہوں"۔

"معافی چاہتا ہوں"۔ اس نے قدرے گھبراتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ "مجھے غلط نہ سمجھئے گا۔ معلوم نہیں آپ سے کیوں پوچھ بیٹھا ہوں"۔

"پوچھنے میں کوئی حرج نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ "مردوں کو میں اکثر غلط سمجھا کرتی ہوں"۔

باتیں کرنے کے فن میں تو مجھے مہارت حاصل تھی۔ میں نے اُسے بڑی غور سے دیکھا۔ اُس کے دانت موتیوں کی طرح صاف اور چمک دار تھے۔ اس کے چہرے پر صحت کی جو رونق تھی اس سے اور دانتوں کی چمک سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ سگریٹ نہیں پیتا۔ وہ میری پیشانی اور آنکھوں کو دیکھتا اور نظریں جھکا لیتا تھا۔ میں نے کچھ اور باتیں کیں تو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے بھاگنے کا راستہ دیکھ رہا ہو یا اسے ڈر ہو کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ میں حیران ہوئی کہ اس نے خود ہی مجھ سے مخاطب ہونے کی دلیری کی اور جب میں اس سے مخاطب ہوئی تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔ "آپ گھومیں پھریں۔ میں چلتا ہوں"۔

"اگر آپ کو جانے کی جلدی نہیں تو آیئے ذرا اکٹھے گھوم پھر لیتے ہیں"۔ میں نے کہا۔ وہ کچھ سوچ کر رُک گیا اور پھر ہم اکٹھے ٹہلنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور کیا کرتا ہے۔

اُس نے بتایا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ کہنے لگا۔

"چند دن مری گزارنے آیا ہوں"۔

"شادی کر چکے ہیں؟"

"نہیں"۔ اس نے جواب دیا اور کہا۔ "آپ اپنے متعلق بھی کچھ بتائیں"۔

میں نے اپنا فرضی نام بتا کر کہا۔ "میں بھی چند دن مری گزارنے آئی ہوں"۔

"آپ شادی شدہ تو معلوم نہیں ہوتیں"۔ اس نے کہا۔ "پڑھتی ہیں؟"

اس کی نظر کتنی ناقص اور تجربہ کتنا محدود تھا۔ وہ میرے چہرے سے یہ بھی نہ پہچان سکا کہ میں اتنی شادیاں کر چکی ہوں جن کی مجھے گنتی بھی یاد نہیں اور میری رگوں میں اتنا خون نہیں جتنی شراب ہے۔ یہ اس بہترین اور مقوی غذا کا اثر تھا جو میں سمگلروں کے ہاں کھاتی تھی۔ بہرحال میری عمر اُس وقت چوبیس سال تھی۔ چہرے سے میری عمر کم لگتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس سال بی اے کا امتحان دیا ہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کی رہنے والی

ہوں اور کس کی بیٹی ہوں۔ میں نے جھوٹ بول کر اسے مطمئن کر دیا پھر ہم مری کے موسم کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر گپ شپ ہوتی رہی۔ میں نے اس میں سنجیدہ سی شگفتگی دیکھی۔ اس کے انداز میں خود اعتمادی تھی۔ مجھے یہی توقع تھی کہ اس ملاقات کا یہی انجام ہوگا کہ وہ مجھے کسی ہوٹل میں دعوت دے گا اور اسی خواہش کا اظہار کرے گا جس سے میں اچھی طرح واقف تھی لیکن اس کی گفتگو کا انداز اتنا پُراثر تھا کہ میں نے تنہائی کا ایک اچھا ساتھی سمجھ کر اسے قبول کر لیا یہاں یہ بتا دینا میں ضروری سمجھتی ہوں کہ میں اس کا نام اور اس کے شہر کا نام نہیں بتاؤں گی۔

"آپ کے ساتھ اور کون آیا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"اکیلی آئی ہوں۔"

"کہاں ٹھہری ہوئی ہیں؟"

میں نے جب ہوٹل کا نام بتایا تو وہ چونک پڑا اور اُس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے کا تاثر نمایاں طور پر بدل گیا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے میرے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس نے کہا۔ "مجھے اجازت ہے؟ چلتا ہوں۔" لیکن میں نے اصرار کر کے اسے بٹھائے رکھا۔ وہ کچھ بے چین ہو گیا تھا۔ اس کی باتوں میں پہلے والی جان اور جوش ہی نہ رہا۔ اُس نے ہوٹل کا نام سُن کر ادھوری سی کوئی بات کی۔ پھر میں ہی بولتی رہی۔ اس نے ایک بار چلے جانے کو کہا تو میں نے پوچھا۔ "آپ کو اچانک کوئی کام یاد آگیا ہے؟ کیا جلدی ہے؟"

"کوئی ایسی جلدی تو نہیں۔" اس نے اُکھڑے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ "خیال یہ ہے کہ کسی نے دیکھ لیا تو شک کرے گا۔"

"کرنے دو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اگر آپ پسند کریں تو شام کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔"

"نہیں۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میں چھوٹا سا آدمی ہوں۔" اُس نے کہا۔ "اتنے بڑے ہوٹل میں جانے کا تو میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"میں لے جا رہی ہوں۔"

"لیکن میں اپنا دماغ خراب نہیں کر سکتا۔" اس نے جھکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ "میں کوئی ایسا غریب تو نہیں ہوں، لیکن میں آپ کے مقابلے میں خاصا نادار انسان ہوں۔"

وہ مجھے اس ہوٹل کی وجہ سے اور میری شکل وصورت اور رنگ کی وجہ سے کسی بڑے ہی امیر باپ کی بیٹی سمجھ رہا تھا۔ میری امیری میں تو کوئی شک نہیں تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کتنی غریب ہوں اور اُس وقت کتنی محتاجی محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے آپ کو یہ بتانے کی پوری کوشش کی ہے کہ یہ آدمی مجھے کیوں اچھا لگا لیکن آپ سمجھ نہیں سکے ہوں گے۔ میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھا سکتی کہ میں نے اس آدمی کو کیوں فوراً ہی دل میں بٹھا لیا تھا جس معصومیت سے اس نے کہا کہ میں آپ کے مقابلے میں نادار انسان ہوں، وہ معصومیت مجھے اتنی پیاری لگی کہ میں نے بے ساختہ کہا۔ "میں آپ کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں اور آپ کو چلنا پڑے گا۔"

اُس کی بے چینی بڑھ گئی لیکن اُس نے انکار نہ کیا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ ہم اُٹھے اور چل پڑے۔ وہ مجھ سے دو تین قدم دُور رہنے کی کوشش کرنے لگا جو میں نے کامیاب نہ ہونے دی۔ اوپر چڑھتے چڑھتے جب ہم سڑک پر پہنچے تو میرا سانس بُری طرح پھول گیا تھا۔ سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے اور ہر کوئی مجھے گھورتا تھا۔ میں نے نقاب آدھے چہرے پر ڈال لیا تھا۔ وہ مجھ سے چند قدم آگے چلا گیا تھا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر دو جوان سے آدمی جا رہے تھے۔ انہوں نے میرے ساتھی کو دیکھ کر ہاتھ ہلائے اور ایک نے کہا۔ "ہیلو کیپٹن۔" اس نے بھی ہنس کر ہاتھ ہلایا۔

میں اس سے جا ملی اور پوچھا۔ "آپ فوج میں کیپٹن ہیں؟"

"ایسی قسمت کہاں۔" اس نے کہا۔ "میں راولپنڈی کی ایک ہاکی ٹیم کا کیپٹن

ہوں۔ یہ دونوں مجھے جانتے ہیں۔"

میں اسے ہوٹل میں اپنے کمرے میں لے گئی اور برقعہ اتار دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "آپ کو میں سمجھ نہیں سکا۔ آپ اتنے بڑے ہوٹل میں رہتی ہیں۔ آپ پوری طرح ماڈرن اور سوشل ہیں۔ پھر یہ برقعہ آپ نے کیوں چڑھا رکھا ہے؟"

"اپنے آپ کو لوگوں سے چھپانے کے لئے۔"

"ایسی کیا ضرورت پیش آتی ہے؟"

"پھر کبھی بتاؤں گی۔" اور میں نے موضوع بدل دیا۔

وہ کچھ جھینپا ہوا تھا۔ میں نے اسے باتوں میں لگا لیا اور اسے یقین دلایا کہ میں نے اس کا صرف ساتھ حاصل کرنے کے لئے اس میں دلچسپی لی ہے۔ میں نے کھانا کمرے میں ہی منگوانے کا آرڈر دے دیا۔ میں نے اس سے اس کے متعلق سب کچھ جاننے کی بہت کوشش کی مگر اس نے کچھ نہ بتایا۔ میں نے ذرا زیادہ بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ اگر اس کے دل میں میرے متعلق کوئی وہم پیدا ہو گیا تو بجا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ایسی لڑکی کا بے نقاب ہو جانا جو اتنے مہنگے ہوٹل میں رہتی تھی ایک عجوبہ تھا۔ مجھے اس کے کردار کا یہ پہلو بہت پسند آیا کہ بے تکلفی کے جواب میں بے تکلف ہونے کی بجائے وہ مجھ سے دُور ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ردِ عمل یہی ہونا چاہیے تھا۔

کھانا امیرانہ تھا۔ وہ کھانے کا سلیقہ جانتا تھا۔ کھانے کے آداب سے آگاہ تھا۔ گفتگو کا فن بھی جانتا تھا۔ وہ ایسا غریب آدمی نہیں تھا جیسا اُس نے اپنے متعلق کہا تھا۔ کھانے کے بعد اُس نے جانے کی اجازت مانگی تو میں نے کہا۔ "میں دُور تک ساتھ چلوں گی۔" وہ مجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے برقعہ اوڑھا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ کچھ دُور تک اس کے ساتھ گئی تو وہ رُک گیا اور مجھے واپس جانے کو کہا۔ تب میں نے بہت ہی زیادہ جذباتی ہو کر اُسے کہا "خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھنا۔ کل ضرور ملنا۔" اس نے اسی جگہ جہاں وہ مجھے ملا تھا ملنے کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔

میں آپ کو اس سے ملنے سے پہلے کی جذباتی حالت بتا چکی ہوں۔ یہ کیفیت ایسی تھی جیسے میرے سارے زخم کھل گئے تھے اور ان سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور اس کیفیت میں وہ مل گیا تو وہ ٹیسیں ختم گئیں مگر وہ چلا گیا تو دل پر پھر وہی گھٹن عود کر آئی۔ بخدا ایسے محسوس ہوا جیسے میرا اور اس کا بڑا ہی گہرا رشتہ ہو۔ اس کی یہ خوبی مجھے بہت ہی اچھی لگی تھی کہ اپنی عمر کے جوانوں کی طرح اس نے میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی بجائے مجھ سے دو قدم دُور رہنے کی کوشش کی تھی جیسے اُسے میرے حُسن اور میرے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی تاہم یہ خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا کہ کسی بھی وقت وہ اُن مردوں کے روپ میں آ جائے گا جو میں سینکڑوں بار دیکھ چکی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ اب میرے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی یا ایسی خواہش کا اظہار کیا تو اپنی فیس بتا کر پیشگی وصول کر لوں گی۔

اُس رات میں خاصی پریشان اور بے چین رہی۔ یہ جواں سال آدمی میری نظروں کے سامنے رہا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ یہ آدمی اُن مردوں سے مختلف ہے جن کے ساتھ میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ یقین مجھے سکون دیتا تھا مگر وہ خطرہ جو میں بیان کر چکی ہوں مجھے پھر بے چین کر دیتا تھا۔ اسی کیفیت میں میری آنکھ لگ گئی اور میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ عورت کی فطرت کے تقاضے عملی صورت میں مجھے خواب میں نظر آئے۔ وہ بچہ بن گیا تھا اور میں اسے اپنی چھاتیوں سے دُودھ پلا رہی تھی۔ میں اس کے سر کو اور اس کے ننھے مُنے ہاتھوں کو چُوم رہی تھی۔ مجھے بادل کی گرج سنائی دی۔ بجلی چمکی۔ اس چمک سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میری گود خالی تھی میں چیختی چلاتی دوڑنے لگی۔ بادل گرج رہے تھے۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں نیلے رنگ کا چھوٹا سا بلب جل رہا تھا۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ چھت پر بارش کا اتنا شور تھا جیسے میں پُل کے نیچے کھڑی ہوں اور اوپر سے ریل گاڑی گزر رہی ہو۔

میرا دل خوف سے بڑی زور سے بج رہا تھا۔ اپنی چھاتیوں پر مجھے بچے کے ہونٹوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ دل میں گھبراہٹ کا یہ عالم کہ میں نے

چھاتیوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھا جیسے میں فی الواقع بچے کو دُودھ پلاتی رہی ہوں۔ خواب تو میں نے بہت دیکھے ہیں۔ خوابوں میں ڈری بھی ہوں مگر آنکھ کھلتے ہی ذہن ٹھکانے آجاتا تھا اور دل کو یہ سکون مل جاتا تھا کہ یہ تو خواب تھا مگر یقین کیجئے کہ اس خواب سے آنکھ کھلی تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ خواب تھا۔ میں اس وہم میں مبتلا ہوگئی کہ اُسے کچھ ہوگیا ہے اور یہ اگر خواب ہی تھا تو خدا کا کوئی اشارہ تھا۔ بارش بڑی ہی تند اور تیز تھی۔ تنہائی کا احساس میرے خوف میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں کمرے میں ہر طرف دیکھنے لگی اور میرے سینے میں پیار کا ایسا طوفان اُٹھا کہ میں اسی بارش میں ہی اُس کے پاس پہنچ جانے کو بے تاب ہونے لگی مگر معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ وہ مجھے راستے میں روک کر چلا گیا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا لیکن وہ میری نظروں کے سامنے سے ہٹا نہیں۔ معلوم نہیں کب میری آنکھ لگی اور جب آنکھ کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے۔ خواب کا اثر ابھی تک دل اور دماغ پر موجود تھا اور اس کے ساتھ یہ بے تابی اور بیقراری کہ اسے فوراً جاکر دیکھوں کہ وہ خیریت سے تو ہے۔

وہ سمجھا میں جاسوس ہوں

وہ دن میری زندگی کا بڑا ہی لمبا دن تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مرد کے لئے میری جذباتی کیفیت اتنی زیادہ بگڑ گئی تھی۔ ایک میرا وہ محسن تھا جو کسی جاگیر دار کا بیٹا تھا۔ اُس نے مجھے اُس وقت پناہ دی تھی جب میرے پیٹ میں بچہ تھا اور میں خاوند سے طلاق لے کر گھر سے بھاگ گئی تھی، اُس کا احسان میں ساری عمر نہیں بھولوں گی لیکن اُس کے ساتھ مجھے ایسی والہانہ محبت نہیں تھی۔ اسے میں نے محبت کا دھوکہ دے کر اپنے ساتھ شادی کے لئے تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ اچھا آدمی نکلا۔ اس کے بعد مجھے اٹلی کے مینجر کا پاکستانی سیکرٹری اچھا لگا تھا مگر اُسے بھی میں شادی کے لئے کہنا چاہتی تھی مگر یہ نوجوان جو مجھے مری میں سر راہے مل گیا تھا، میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس کے انتظار میں دن کاٹنا محال ہوگیا۔

میں وقت سے پہلے اُس جگہ پہنچ گئی جہاں اُسے آنا تھا۔ بہت دیر ٹہلتی رہی۔ یہ جگہ نیچے تھی۔ میں بار بار اُوپر دیکھتی تھی۔ آخر وہ مجھے نظر آگیا۔ میں دوڑتی ہوئی اُوپر کو جانے لگی۔ وہ بھی تیزی سے نیچے آیا اور جب وہ میرے قریب آیا تو میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ وہ بوکھلا گیا۔ اس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبایا نہیں۔ اس کا ردِعمل سرد تھا۔ میں اسے ہر طرف سے یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی بچہ گر پڑے تو اُسے ماں دیکھتی ہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"نیچے چلو، بتاتی ہوں۔" میں نے کہا اور جذبات کی شدت سے آپ کی بجائے

"تم" کہہ کر مخاطب ہوئی۔ "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا۔

نیچے جاکر ہم بیٹھ گئے اور میں نے اسے رات کا خواب سنا دیا اور کہا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے، مگر میں دل کی بات کہتے ہوئے جھجکوں گی نہیں کہ زندگی میں پہلی بار میری جذباتی کیفیت نے یہ رنگ اور یہ شدت اختیار کی ہے۔ تم میرے دل میں اُتر گئے ہو۔"

اس نے خوش ہونے کی بجائے مجھے یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ خواب کا اثر قبول نہیں کرنا چاہئے۔ اُس نے مجھے اپنے دو تین بڑے ہی ڈراؤنے خواب سنا دیئے۔ پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی اور سورج غروب ہو گیا۔ میں نے اسے ہوٹل میں چلنے کو کہا تو وہ ٹالنے لگا لیکن میں اصرار کر کے اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اسے اچھا بھلا دیکھ کر مجھے سکون محسوس ہُوا اور جب یہ دیکھا کہ اس میں کل والی جھجک نہیں تو مجھے ایسی مسرت محسوس ہوئی جس سے میں ہمیشہ ناآشنا رہی تھی۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے میں سوچ رہی تھی کیا میں اس ہم عمر آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں؟ کیا یہ مجھے قبول کر لے گا؟ ..... نہیں۔ میں اسے دھوکہ نہیں دوں گی۔ میں اس کے قابل نہیں اور اگر اس نے مجھے شادی کے لئے کہا تو میں اسے صاف صاف بتا دوں گی کہ میں کون اور کیا ہوں اور اسے کہوں گی کہ اب فیصلہ کرو۔

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے سے گریز کر رہا تھا۔ مجھ سے دو تین قدم آگے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قریب سے لوگ گزر رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ یہ سب مجھے بڑی غور سے دیکھتے تھے۔ وَردی پہنے ہوئے فوجی بھی ہمارے قریب سے گزرے اور ہم مال روڈ کے تماشائیوں میں سے گزرتے اپنے ہوٹل والی چڑھائی چڑھنے لگے۔ میں تھک گئی تھی۔ آگے بڑھ کر میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور اُس کے سہارے اوپر گئی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ میں اس مرد کو بالکل اسی طرح گرویدہ بنانے کی کوشش کر رہی ہوں جس طرح مرد عورتوں کو پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم کمرے میں جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میں نے پوچھا۔

"کیپٹن آپ کی رجمنٹ کون سی ہے اور کہاں ہے؟ آپ پندرہ روز کی چھٹی آئے ہیں نا!"

اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھا اور میرے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔ "تم مینٹل کیس ہو یا جاسوس کہاں جانا پسند کرو گی؟ مینٹل ہاسپٹل میں یا ملٹری انٹیلی جنس کے پاس۔"

میں بیسوا تھی۔ اس لحاظ سے میرا کوئی کردار نہیں تھا۔ میں زمین دوز دنیا کی شہزادی تھی مگر باعزت سوسائٹی کی دھتکاری ہوئی تھی۔ میں وہ طوائف تھی جسے آپ لوگ گالی کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔ میرا وجود غلیظ اور میری ذات ننگی گالی سے زیادہ ننگی تھی مگر میں جاسوس کا لفظ برداشت نہ کر سکی۔ جاسوس سے مراد ہندوستان کی جاسوس تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کیسے ہیں۔ ایک ہی مہینہ پہلے رَن کچھ میں دونوں ملکوں کی جنگ ہوئی تھی۔ میں نے اخبار میں بھی پڑھا تھا کہ ہندوستان کے وزیراعظم شاستری نے کہا ہے کہ اب ہم اپنی مرضی کا محاذ کھولیں گے۔ میں نے اخباروں میں جنگ کی ساری خبریں پڑھی تھیں لیکن کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس جنگ کا ہم پر یہ اثر پڑا تھا کہ سمگلنگ رُک گئی تھی اور ہم اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ راستہ کب صاف ہو گا مگر اس آدمی نے جب مجھے جاسوس کہا تو ایک لمحے میں میرا ذہن اٹھارہ برس پیچھے چلا گیا جب میں ذرا سی بچی تھی اور پاپیادہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان میں آئی تھی۔ وہ شعلے جو میں نے اپنے گاؤں کو جلاتے دیکھے تھے وہ میرے سینے میں بھڑک اُٹھے اور اُس کے مُنہ سے جاسوس کا لفظ سن کر یہی شعلے کی طرح بھڑک اُٹھی۔ میرے ہونٹ کانپنے لگے۔ میں جوش سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ پاک فوج کا کیپٹن تھا

"سنو پاک آرمی کے کیپٹن...." میری آواز رندھیا گئی۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتی تھی۔ مجھے ہچکی سی آئی اور بڑی مشکل سے اپنی آواز کو اور اپنے آپ کو سنبھال کر اُسے کہا۔ "پیشتر اس کے میں تمہارے مُنہ پر تھوک دوں، میرے ساتھ وعدہ کرو کہ مجھے آئندہ جاسوس نہیں کہو گے۔ تمہیں یہ شک کیوں ہُوا ہے؟"

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ میں پاک آرمی کا کیپٹن ہوں؟" اس نے پوچھا۔ "تمہیں میرا صحیح نام کس نے بتایا ہے؟ مجھ میں تمہیں کیا کشش نظر آئی ہے کہ میرے ساتھ اتنی بے حیائی سے بے تکلف ہوگئی ہو؟ تم اتنی امیر لڑکی مجھ جیسے عام آدمی کو پھانسنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ تم یہاں اکیلی کیوں رہتی ہو؟ مجھے سارے سوالوں کا جواب دو .... سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم کس کی بیٹی ہو؟"

"میں؟" میں نے چلّا کر کہا۔ "میں کسی کی بیٹی نہیں۔" اور میں سر ہاتھوں میں ڈال کر بے قابو ہو کے رونے لگی۔ اچانک ہی میرے آنسو ختم ہو گئے۔ میں نے سر جھٹک کر اوپر اُٹھایا۔ وہ کھڑکی کھولے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "ادھر آؤ، میں تمہارے سوالوں کا تمہیں جواب دوں۔"

وہ وہیں کھڑے کھڑے گھوما اور آہستہ سے بولا۔ "کہو۔ میں سن رہا ہوں۔"

اس کے چہرے پر ایسا وقار اور ایسا رعب تھا جو میں نے اس عمر کے آدمی میں کم ہی کبھی دیکھا تھا۔ میں اسے دھتکار دینا چاہتی تھی۔ میری زبان سے یہ الفاظ نکل چلے تھے کہ جاؤ لے آؤ اپنی ملٹری پولیس کو۔ میں دیکھتی ہوں کہ جاسوسی کے الزام میں مجھے کون گرفتار کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھ میں اتنی پاور تھی یا یوں کہہ لیجئے کہ میرے ہاتھ میں اتنی پاور والے افسر تھے کہ جو مجھ پر ہاتھ ڈالتا

اُسے میں نوکری سے نکلوا دیتی لیکن اُس نے جب گھوم کر مجھے دیکھا تو اس کے پُرشباب چہرے کے جلال اور رعب نے میرے اعصاب پر قبضہ کرلیا۔ میں اس سے اس لئے نہیں دبکی تھی کہ وہ فوج کا کپتان ہے اور مجھے گرفتار کروا دے گا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ میری شخصیت پر چھا گیا تھا۔

"مجھے اس طرح معلوم ہُوا کہ تم کیپٹن ہو کہ کل دو آدمیوں نے تمہیں کہا تھا۔ ہیلو کیپٹن۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم ہاکی ٹیم کے کیپٹن ہو۔ میں مان گئی تھی۔ آج شام جب ہم مال روڈ پر آرہے تھے تو تم مجھ سے آگے تھے۔ وردی پہنے ہوئے دو فوجیوں نے تمہیں سیلوٹ کیا تھا اور تم نے سیلوٹ کا جواب دیا تھا۔ میں جان گئی کہ تم ہاکی ٹیم کے نہیں پاک فوج کے کیپٹن ہو۔ اس کی تصدیق اس طرح ہوئی کہ جب ہم ہوٹل کے راستے پر اُوپر چڑھنے لگے تھے، میں تم سے چار پانچ قدم پیچھے تھی۔ تمہاری طرح کے دو جوان سے لڑکے میرے قریب سے گزرے تو ایک نے تمہارا نام لے کر کہا تھا، کیپٹن جا رہا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ تم نے مجھے اپنا غلط نام بتایا تھا اور تم مجھ سے اپنا عہدہ پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ تمہاری ڈیل ڈول اور تمہاری بول چال بتاتی ہے کہ تم فوجی ہو۔"

"یہاں تک میں نے مان لیا۔" اس نے کہا۔ "میرے باقی سوالوں کا جواب دو۔ میں تمہارا شک یہ بتا کر رفع کر دینا چاہتا ہوں کہ انڈیا کے ساتھ ہماری جنگ ختم نہیں ہوئی۔ صرف رن کچھ کی لڑائی ختم ہوئی ہے۔ میں چاہوں تو پندرہ منٹ کے اندر یہ ہوٹل سیل کروا سکتا ہوں۔ تم انڈیا کی جاسوس ہو تو یہاں سے زندہ انڈیا نہیں جا سکو گی۔"

اب کے میرا ردِعمل کچھ اور تھا۔ میں دراصل نارمل ذہن کی لڑکی نہیں تھی۔ میری دنیا کی کوئی لڑکی، کوئی عورت اور کوئی مرد نارمل ذہن کا نہیں۔ ہم لوگ ابنارمل ہیں۔ ابنارمل انسان کا ردِعمل اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا تھا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر انڈیا کا جاسوس کہا تو میں نے غم اور ملال سے بوجھل آواز میں کہا۔ "میں انڈیا کی جاسوس نہیں۔ انڈیا کی مہاجر ہوں۔ پناہ گزین ہوں۔ اٹھارہ سال گزر گئے ہیں۔ ابھی تک مجھے پناہ نہیں ملی۔ میں نے جسے منزل سمجھا وہ سراب نکلا۔

تم مجھے دیانتدار معلوم ہوتے ہو۔ فوجی ہو نا! لیکن ایک بڑی لمبی کہانی سنانے سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم اگر یہ ہوٹل سیل کرا سکتے ہو تو میں پندرہ منٹ کے اندر سیل تڑوا سکتی ہوں۔ جس ملک کی آن پر تم جیسے نوجوان لیفٹیننٹ اور کپتان جانیں قربان کر دیتے ہیں اس ملک میں حکمران میری مٹھی میں ہیں۔ تم سرحدوں پر خون بہاتے ہو اور ہمارے بادشاہ سرحدوں کے اندر شراب کے مٹکے بہا دیتے ہیں۔"

"میرے ساتھ سیدھی سیدھی بات کرو۔" اس نے کہا۔ "یہاں کسی فلم کی شوٹنگ نہیں ہو رہی۔"

"میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" میں نے اسے کہا۔ میرے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے پاس اتنا وقت ہے کہ میری پوری بات سن سکو؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ میں نے تم جیسے عام آدمی کو پھانسنے کی کوشش کیوں کی تھی، مجھے بات اُس وقت سے شروع کرنی پڑے گی جب میں پاکستان میں داخل ہوئی تھی۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے بچپن سے کہانی شروع کی اور مری میں اس کی ملاقات پر ختم کی۔ جو باتیں اور واقعات آپ کو سُنا چکی ہوں، وہ تمام کے تمام اُسے سُنا دیئے۔ کوئی ایک بھی بات نہیں چھپائی۔ سناتے سناتے میں کئی بار روئی کئی بار ہنسی اور جب میں نے بات ختم کی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے اُسے گزشتہ رات کی کیفیت سناتی جب تنہائی کے احساس نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا اور میں اسی دیوانگی میں باہر نکل گئی تھی اور میری اسی جذباتی کیفیت میں وہ مجھے مل گیا تھا۔ اُس نے آہ بھری اور صوفے سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ آپ اپنے متعلق سوچیں۔ میری آپ بیتی سنتے سنتے تین چار بار آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ آپ پختہ عمر کے انسان اور حساس قسم کے ایڈیٹر ہیں، اس لئے آپ اپنے آنسو روک نہ سکے۔ وہ پاک فوج کا کیپٹن تھا۔ فوجی ٹریننگ نے اُسے سخت جان بنا دیا تھا اس لئے اُس نے آنسوؤں کو آنکھوں

یں نہیں آنے دیا مگر وہ مجھ سے چھپا نہیں سکا کہ وہ آنسو روک رہا ہے۔ اس کی اتنی اچھی، اتنی پیاری آنکھیں کئی بار لال سُرخ ہو گئیں۔ دو تین بار اس نے مٹھیاں بھینچ کر صوفے پر گھونسے مارے۔ وہ انہماک سے سنتا رہا۔

میں نے سُنا ہے کہ جاسوس عورتیں پکڑی جاتی ہیں تو وہ اپنے متعلق دردناک کہانیاں سنا کر اپنی مظلومیت کا اظہار کرتی اور اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرتی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کسی کو متاثر بھی کر سکتی ہیں یا نہیں لیکن میری کہانی من گھڑت قصہ نہیں تھا۔ یہ میرے سینے کی تحریر تھی جو میں نے اُسے پڑھ کر سنائی تو وہ بے قراری کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ میں اب بھی تمہارے اس سوال کا جواب دے سکی ہوں یا نہیں کہ میں جو اتنی امیر لڑکی ہوں تم جیسے عام آدمی کو کیوں پھانسنا چاہتی تھی"۔ میں نے کہا۔ "تم فوجی ہو۔ پتھر ہو۔ تم موم ہو جاؤ تو ملک کا دفاع نہ کر سکو۔ تم میرے کل رات کے جذبات نہیں سمجھ سکے"۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا اور کولہوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں دلیری سے بتا دیا ہے کہ میں سمگلر گروہ سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں نے تمہاری کپتانی سے ڈر کر اقبالِ جرم نہیں کیا۔ یہ کانٹے ہیں جو میں نے اپنے ضمیر اور اپنی روح سے چُن چُن کر نکالے اور تمہارے آگے رکھ دیتے ہیں۔ میں ذرا سی دیر میں اتنی دولت اکٹھی کر سکتی ہوں کہ تم جیسے آدھی درجن کپتان خرید کر اپنے پاؤں میں بٹھا سکتی ہوں۔ میں نے اس ہوٹل میں دولت مند گاہکوں کو پھانسا ہے۔ تمہیں پھانسنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ تم نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم نادار ہو اور اس ہوٹل میں آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے مگر تمہاری قیمت اتنی زیادہ ہے جو میں نہیں دے سکتی۔ میں نے تمہیں وہ مرد بتائے ہیں جن کے وجود میں مجھے منزل نظر آتی تھی مگر وہ منزل کا فریب تھا۔ وہ میرے جسم سے کھیلے اور اپنی راہ لگ گئے۔ ایک تم ہو کہ میرے جذبات کو فوجی بوٹوں تلے کچل رہے ہو۔ میں انڈیا کی جاسوس نہیں، انڈیا کی دشمن ہوں۔ اگر جاسوسی کے لئے تم مجھے ٹریننگ دے کر انڈیا میں بھیج دو تو مجھے روحانی خوشی ہو گی"۔

"پاکستان اتنا بے غیرت ملک نہیں کہ کسی عورت کو دشمن کے ملک میں بھیجے"۔ اس نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ جاسوس عورتیں اپنی عصمت کا ہتھیار استعمال کیا کرتی ہیں مگر ہم ابھی زندہ ہیں"۔ اس نے ذرا سوچ کر پوچھا۔ "کیا تمہیں توقع تھی کہ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا؟"

"میری توقع اور میری امید اتنی مجروح ہو گئی ہے کہ اب میں اس سے دستبردار ہو چکی ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔ "پھر بھی میرے سینے میں ایک عورت اس امید پر زندہ ہے کہ ایک آدمی آئے گا جو مجھے اس جہنم سے نکال لے جائے گا۔ اب جبکہ میں نے تمہیں اتنی واضح تفصیل سے بتا دیا ہے کہ میں کیا ہوں اور میرا ماضی کیسا ہے تو میں تم جیسے نوجوان سے ایسی توقع کیسے وابستہ کر سکتی ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کر لو گے؟"

"کر لوں گا"۔ اس نے فوجیوں کے دو ٹوک لہجے میں "کر لوں گا" یوں کہا جیسے اُس نے کہا ہو کہ میرے پاس رائفل ہے، میں گولی چلا دوں گا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آیا۔ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے دونوں گالوں پر رکھ کر میرا چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اُٹھی اور دوسرے لمحے ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔ وہ فوجی تھا۔ اس کے بازوؤں کی گرفت اور طاقت سے میری پسلیاں چیخ اٹھیں لیکن مجھے کیسا سکون اور کیسا نشہ آور قرار ملا، میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں مرد کے بازوؤں اور جسم کے کسی بھی حصے سے ناآشنا نہیں تھی۔ مردوں نے میرے جسم کو بے دردی سے چچوڑا اور جھنجھوڑا تھا مگر یہ پہلا مرد تھا جس کی گرفت میں وارفتگی اور پیار کی شدت تھی۔

پھر یوں ہُوا کہ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ صوفے پر لیٹا ہُوا تھا۔ اس کا سر میری گود میں تھا اور میں بار بار اس کا مُنہ یوں چُوم رہی تھی جیسے وہی میرا بچہ ہو جسے میری کوکھ نے جنم دیا اور جسے میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے کہہ ہی دیا۔ "میں تمہیں خاوند نہیں بنا سکوں گی"۔

"کیوں؟" اس نے قدرے بدک کر پوچھا۔

"ایسے لگتا ہے جیسے تم میرے وہی بچے ہو جسے میں ہسپتال میں جن کر عیسائیوں کے حوالے کر آئی تھی۔"

وہ چونکہ فوجی تھا، میری طرح فلمی اور ڈرامائی مکالمے نہیں بول سکتا تھا اس لئے اس نے کہا۔ "خدا کے لئے مجھے حرامی بچہ تو نہ بناؤ۔ میں اصل حلالی ہوں۔"

میری ہنسی نکل گئی۔ اعصاب پر جو تناؤ تھا ختم ہو گیا اور مجھے یاد آ گیا کہ ہم نے کھانا تو کھایا ہی نہیں۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ یہ اُن ہوٹلوں میں سے ایک ہوٹل تھا جو دن کو سوتے اور رات کو جاگتے ہیں۔ میں نے فون کر کے کھانا کمرے میں لانے کو کہنے لگی تو اس سے پوچھا "کچھ پیو گے؟ وہسکی بیئر...؟"

"میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا" اس نے کہا "تم پینا چاہو تو منگوا لو میں تمہیں تو نہیں روک سکتا" میں اسے بتا چکی تھی کہ میں نے کیسے کیسے نشے کئے ہیں اور اب کتنی شراب پی جاتی ہوں۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ مجھے عادی شراب نوش سمجھ کر اس نے کہا کہ میں تمہیں تو نہیں روک سکتا۔ میں نے اسے کہا۔ "اگر تم یہ کہتے کہ میرے سامنے مت پینا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ میں نہیں پیوں گی اور وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی نہیں پیوں گی۔"

کھانا آیا، ہم نے کھایا۔ اُس پر سنجیدگی سی طاری رہی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اُس نے زندگی کا بڑا ہی اہم، بے حد نازک اور بڑا ہی خطرناک فیصلہ کیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ ڈر رہا ہے پرکھ رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ جو راستہ اس نے منتخب کیا ہے اس پر چلے یا نہ چلے۔ میں نے اسے ایسا یقین دلانے کی کوئی کوشش نہیں کی کہ میں اس کی وفادار رہوں گی، دھوکہ نہیں دوں گی وغیرہ۔ میں نے کوئی قسم نہیں کھائی۔ میں نے جس انداز میں اُسے اپنی آپ بیتی سنائی تھی اس انداز نے اور میرے آنسوؤں نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ اندر سے میں کیا ہوں۔

"تمہیں واپس جانا ہوگا" کھانے کے بعد میں نے وقت دیکھ کر کہا۔ "ڈیڑھ بج چکا ہے۔"

"میں چھٹی پر ہوں" اس نے جواب دیا۔

"یہیں سو جاؤ۔"

وہ مان گیا۔ میرے پاس اس کے لئے کوئی پاجامہ نہیں تھا میں نے اپنی ایک ریشمی چادر اسے دے دی جو اُس نے پتلون اُتار کر باندھ لی اور بش شرٹ اُتار کر بنیان پہنے رکھی۔ وہ صوفے پر لیٹ گیا۔ میں نے بے ساختگی سے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ اس نے پوچھا "تم صوفے پر سوؤ گی؟" میں جواب دینے کی بجائے اس کے ساتھ پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس نے الگ سونے کی ضد کی جو میں نے پوری نہ ہونے دی۔ اس نے ہنس کر مجھے ایک کہانی سنائی۔ اس نے کہا "مجھے معلوم نہیں یہ کہانی سچی ہے یا افسانہ ہے۔ بہرحال مجھے اچھی لگتی ہے۔ نپولین نے جب روس پر حملہ کیا تو اس کی ایک بٹالین (پلٹن) نے روسی علاقے کے اندر جنگل میں کیمپ کیا۔ شام کے بعد ایک جوان روسی عورت جو بہت خوبصورت تھی، نپولین کی ایک بٹالین کے کمانڈر کے خیمے میں گئی۔ وہ دیہاتی لگتی تھی۔ اس نے مظلوم عورت بن کر بٹالین کمانڈر کو بتایا کہ جنگ نے اسے تباہ کر دیا ہے۔ اُس کا خاوند، اس کے بچے اور اس کے مویشی مارے گئے ہیں۔ بٹالین کمانڈر اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا اس نے ہمدردی کی خاطر اس عورت کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کی دلجوئی کرنے لگا....

"عورت نے بٹالین کمانڈر کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی اور اس سے اس قسم کی باتیں پوچھنے لگی کہ یہاں سے اس کی بٹالین کہاں جا رہی ہے اور اب نپولین کا کیا ارادہ ہے۔ بٹالین کمانڈر فوراً سمجھ گیا کہ یہ عورت دیہاتی نہیں بلکہ تربیت یافتہ جاسوس ہے۔ اس نے اس عورت سے صاف کہہ دیا کہ تم جاسوس ہو۔ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ عورت نے منت کی کہ وہ اسے محض شک میں گولی نہ مارے۔ وہ تو پہلے ہی تباہ و برباد ہو گئی ہے۔ کچھ دیر کی بحث و مباحثہ کے بعد بٹالین کمانڈر نے اسے کہا۔ میں ایک سال سے اپنی بٹالین کے ساتھ جنگلوں اور پہاڑوں میں پھر رہا ہوں اور مسلسل لڑ رہا ہوں۔ اعصاب تھک گئے ہیں اور میں نے ایک سال سے عورت کے جسم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں تمہیں اس شرط پر چھوڑ دوں گا کہ آج رات میرے ساتھ گزارو....

"عورت نے جواب دیا۔ پھر ایک شرط میری بھی مانو۔ میں ایک کی بجائے دو

راتیں تمہارے پاس گزاروں گی۔ اس کے عوض نپولین کے حملے کا نقشہ دکھا دو۔"

بٹالین کمانڈر نے اُسی وقت اُسے نپولین کے حملے کی ساری سکیم بتادی اور نقشہ بھی دکھادیا۔ یہ روسی عورت واقعی جاسوس تھی اور یہی معلوم کرنا چاہتی تھی جو اسے بٹالین کمانڈر نے بتادیا تھا۔ اس کے عوض وہ اس رات بٹالین کمانڈر کے خیمے میں رہی۔ صبح ہوتی تو اُس نے جانے کی اجازت مانگی۔ بٹالین کمانڈر نے ریوالور نکال لیا اور اس عورت سے کہا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا کہ اس شرط پر رات میرے پاس گزارو کہ صبح تمہیں چھوڑ دوں گا۔ گولی نہیں ماروں گا مگر تم نے اس شرط پر میری خواہش پوری کی ہے کہ میں تمہیں نپولین کے حملے کی سکیم اور اس کا نقشہ دکھادوں۔ میں نے تمہاری شرط پوری کر دی تھی۔ اب چونکہ تمہارے پاس میرا ایک فوجی راز ہے اور تم دشمن کی عورت ہو اس لئے میں تمہیں گولی مارتا ہوں، اس نے ریوالور سیدھا کیا اور روسی عورت کو گولی مار دی۔"

اس نے یہ کہانی از راہ مذاق سناتی۔ میں نے اس سے کہا۔ "نہ میں تم سے کوئی راز پوچھ رہی ہوں نہ تم نپولین کے بٹالین کمانڈر والی خواہش کا اظہار کر رہے ہو۔ پھر مجھے گولی کیوں مارو گے؟"

ہم ہنسی مذاق کے موڈ میں آگئے۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے ہم اس طرح ایک ہی پلنگ پر لیٹے ہوتے ہنستے کھیلتے اور گپ شپ لگاتے رہے جیسے چھ سات سال کی عمر کے دو بچے اکٹھے لیٹے ہوتے ہوں۔ ہم سو گئے اور دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب جاگے۔ میں مان گئی کہ یہ ہے مرد جس کی مجھے تلاش تھی۔ کیا آپ مجھے کوئی ایسا مرد دکھا سکتے ہیں جو ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کے ساتھ رات بھر لیٹا رہے اور کوئی نازیبا حرکت نہ کرے؟

وہ نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے چلا گیا۔ اُس نے مجھے پچھلے پہر وہیں ملنے کو کہا جہاں ہم پہلے روز ملے تھے۔

چند دن پاک فوج کے کیپٹن کے ساتھ

اُس کے جانے کے بعد میں کمرے میں بیٹھ گئی اور اس کے متعلق سوچنے لگی۔ کبھی تو یقین آجاتا کہ اس نے مجھے قبول کر لیا ہے اور کبھی میں اس وہم میں اُلجھ کر پریشان ہونے لگتی کہ نہیں، وہ میرے ساتھ کھیل رہا ہے۔ چھٹی کے باقی دن میرے ساتھ گزار کر چلا جائے گا۔ پھر مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ اور کبھی یہ خیال آجاتا کہ وہ مجھے محبت کا دھوکہ دے کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میں جاسوس ہوں یا نہیں۔ یہ وہم اس وجہ سے پختہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس لڑکی پر ایسے پختہ کردار کا کیپٹن کیسے اعتماد کر سکتا ہے جو اسی عمر میں پختہ کار سوسائٹی گرل، شرابی اور سمگلر بن گئی تھی لیکن میری کہانی سُن کر اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ ایسے مجھ پر اعتبار آ گیا تھا .... ایسے ہی اُلٹے سیدھے خیال مجھے پریشان بھی کرتے رہے اور بہلاتے بھی رہے۔ باقی دن اسی کشمکش میں گزر گیا۔

برقعہ اوڑھ کر میں اُس جگہ پہنچی جہاں ہماری پہلی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ وہاں ٹہل رہا تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ میں نے سب سے پہلے اسے بتایا کہ میں کس کشمکش میں مبتلا رہی ہوں۔ یہ بات میں نے اچھے خاصے شگفتہ انداز میں شروع کی تھی مگر بات کرتے کرتے میرے آنسو نکل آتے۔ میں نے بے تابی سے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور آنسوؤں سے ڈوبی ہوتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر بھیک مانگنے کے لہجے میں کہا۔ "خدا کے لئے مجھے بتا دو کہ تم میرے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہے ہو؟ مجھے گولی مروانا چاہتے ہو تو ذرا جلدی کرو۔ میرے ساتھ دل بہلا کر چلے جانا چاہتے ہو تو ذرا جلدی چلے جاؤ۔"

"میں نے تمہارے ساتھ دل نہیں بہلایا۔" اُس نے کہا۔ "لیکن خدا کی قسم، تمہارا

دل بہلالوں گا۔ اسے توڑدوں گا نہیں۔ یہ وہم مجھے کرنا چاہیئے تھا، تمہیں نہیں۔ میں بھی سارا دن اسی کشمکش میں مبتلا رہا ہوں جس میں تم پریشان ہوتی رہی ہو۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم پر مجھے کیوں اعتبار آگیا ہے کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گی۔۔۔ کیا تم پسند کرو گی کہ میں تمہیں زیبی کہا کروں؟"

"کیوں؟ زیبی کیوں؟"

"یہ نام مجھے اچھا لگتا ہے۔" اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "عرصہ گزرا سُنا تھا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ شادی کروں گا تو بیوی کو زیبی کہا کروں گا۔"

اس کا لب و لہجہ بچوں جیسا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو بڑی ہی غور سے دیکھا۔ جانے کیوں دل میں یہ یقین بیٹھ گیا کہ یہ میرے بچے کا چہرہ ہے۔ اس نے میری فطرت کا خلا پُر کر دیا تھا۔

"سنو زیبی!" اس نے کہا۔ "میں فوجی ہوں۔ ہماری ٹریننگ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ ہماری عادتیں بدل جاتی ہیں۔ فوجی کوئی بات یا کام کرتا ہے تو اس کے ہر پہلو پر غور کر لیتا ہے۔ خوش فہمی ہماری عادات سے نکال دی جاتی ہے۔ ہم خطروں پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔ پلان بناتے ہیں۔ اسے ہر زاویے سے پرکھتے ہیں۔ پھر مُنہ سے بات نکالتے یا عمل کرتے ہیں۔ ہم جذبات سے مغلوب نہیں ہُوا کرتے۔ تمہیں ایسی ٹریننگ نہیں ملی۔ تمہاری زندگی ڈسپلن کے نام سے ہی ناواقف رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ تم شہزادی ہو۔ تم نے جذبات سے مغلوب ہو کر فیصلہ کیا ہے۔ تم ازدواجی زندگی کی پابندیوں سے اُکتا کر اپنے فیصلے پر پچھتاؤ گی۔ میری تنخواہ محدود ہے۔ میری زندگی ایک حقیقت ہے جو تم جیسی آزاد خیال لڑکی کو پسند نہیں آئے گی۔ آج رات تنہا بیٹھ کر ان حقائق کو سامنے رکھنا اور سوچنا۔ ہو سکتا ہے تم اپنا فیصلہ بدل لو۔"

میں نے اسے پھر وہی باتیں کہیں جو گزشتہ رات کہہ چکی تھی۔ میں نے اسے یہ بھی کہا۔ "مجھے ایک بار پھر سوچنے کے لئے نہ کہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھٹک جاؤں۔ میرے ماضی کو مر جانے دو۔ اسے مارنے میں میری مدد کرو۔"

ایسی ہی بہت سی باتیں تھیں جو میں نے کیں اور اسے یقین دلایا کہ میں

اس کے ساتھ شادی کروں گی یا اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔

سورج غروب ہو گیا۔ رات تاریک ہونے لگی اور ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر میں سر اس کے زانو پر رکھ کر گھاس پر لیٹ گئی اور وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ مجھے وہی سکون مل گیا جو تھکے ماندے راہ رَو کو منزل پر پہنچ کر ملتا ہے۔ میں بڑی ہی طویل اور بے حد کٹھن مسافت طے کر کے منزل پر پہنچی تھی۔ مجھے نیند آنے لگی۔ وہ مجھے کوئی بات سُنا رہا تھا جو میں خواب کی بات کی طرح سُن رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "چلو، اب چُھٹی کریں۔"

میں بیدار ہو گئی۔

اُس رات وہ میرے ہوٹل میں جانے پر رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ کہنے لگا کہ بُرا لگتا ہے کہ ہر روز تم مجھے کھانا کھلاؤ۔ میں ضد کر کے اُسے لے گئی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں ہوٹل میں مفت رہ رہی ہوں اور کھانے کا بِل بھی ادا نہیں کرتی۔ اگر ہوٹل میں مجھے کمرے اور کھانے کے پیسے دینے پڑتے تو میرے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ بنک میں بہت پیسہ تھا۔ اس پیسے سے مجھے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اب تو یہی ایک خواہش رہ گئی تھی کہ اپنا گھر بساؤں اور اپنی اصلیت کی طرف لوٹ جاؤں۔

اُس کی کہانی

رات کھانے کے بعد میں نے اُس سے پوچھا "تم والدین سے شادی کی اجازت لو گے؟ میرے متعلق انہیں کیا بتاؤ گے؟"

"میرے والدین نہیں ہیں" اس نے جواب دیا۔

"فوت ہو گئے ہیں؟"

"ماں فوت ہو گئی ہے۔" اُس نے آہ بھر کر بڑے ہی اداس لہجے میں کہا "باپ زندہ ہے لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ وہ بھی مر گیا ہے۔" اُس نے مُنہ پھیر لیا اور جیب سے رومال نکال کر اُس نے آنکھیں صاف کیں۔ میں جان گئی کہ اُس نے آنسو پونچھے ہیں۔

اُس کے آنسو میری برداشت سے باہر تھے۔ میں گیند کی طرح اُچھل کر اُٹھی اور دَوڑ کر اس کا سَر تھاما اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُس کے آنسو تو بے تحاشا بہہ رہے تھے۔ میں نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھے اور دیوانگی کے عالم میں اُس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو چُومنے لگی۔ وہ آخر مرد تھا، سنبھل گیا مگر میں سنبھل نہ سکی۔ میں تو اس جوان سال آدمی کو ٹھنڈی چھاؤں سمجھتی تھی مگر یہ چھاؤں کسی دُکھ سے تپ رہی تھی۔ ایسے مضبوط مرد کے آنسوؤں نے میرے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آگیا کہ مجھ سے زیادہ دُکھی اور کون ہو گا۔ اگر ممکن ہو سکے تو میں اس کے بھی دُکھ اپنے سینے میں ڈال لوں۔ میری اس وقت کی جذباتی کیفیت ماں جیسی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ میں جوان لڑکی ہوں اور یہ میری عمر کا آدمی ہے۔ میں نے اُس کا مُنہ اوپر کیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر اس مسکراہٹ میں اس نے آنسوؤں کے دریا سمیٹ لئے تھے۔

میں نے اُس کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں؟ تم بھی میری طرح رو پڑے؟ تم تو مرد ہو؟"

"برسوں بعد آنسو نکلے ہیں"۔ اُس نے کہا اور اُس کی آہ نکل گئی۔ کہنے لگا۔ "میں نے کبھی کسی کے ساتھ ہمدردی نہیں کی تھی اور نہ کبھی چاہا تھا کہ میرے ساتھ کوئی ہمدردی کرے۔ میں نے محبت اور پیار کے صرف نام سُنے تھے۔ نہ کبھی محبت دیکھی نہ کہیں پیار ملا۔ میرے دل میں بے پناہ پیار ہے مگر وہ پاکستان کے لئے ہے، خاکی وردی کے لئے ہے، اور اپنے ہتھیاروں سے مجھے محبت ہے اور مجھے محبت ہے اپنے جوانوں سے۔ میری زندگی کا مشن ہے پاکستان کا دفاع اور سرحد پہ ہی کہیں جان دے دینا۔ اگر میرے دل میں یہ مشن اور یہ جذبہ پیدا نہ ہوتا تو آج میں جیل میں ہوتا۔ جیبیں کاٹ رہا ہوتا۔ تالے توڑ رہا ہوتا یا کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر ہائی سٹینڈرڈ کا غنڈہ بن جاتا۔ ہمارے ملک میں دھتکارے ہوتے بچوں کا مستقبل یہی ہوتا ہے"۔

میں اُس کی آپ بیتی سمجھ گئی تھی۔ ظالم باپ کے بچّے کی جذباتی کیفیت یہی ہوتی ہے جو وہ بیان کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی یہ حالت دیکھ کر خوشی ہوتی۔ خوشی اس لئے کہ جس طرح میں ابنارمل ذہن کی لڑکی تھی، اسی طرح وہ بھی نارمل نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے اپنے کردار میں پختگی پیدا کر لی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ اور میں سن رہی تھی۔ میں اسے روکنا اور ٹوکنا نہیں چاہتی تھی۔ سیاہ کالے دھوئیں کی طرح اُس کے سینے سے باتیں نکل رہی تھیں۔ میں خاموشی سے سنتی رہی۔ اس ڈر سے اس سے کوئی سوال نہ پوچھا کہ اس کی روانی تھم نہ جائے۔ اس وقت بھی جب کہ آٹھ نو سال گزر گئے ہیں، مجھے اُس کا ایک ایک لفظ یاد ہے اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کس لفظ کے ساتھ اُس کی آہ نکل گئی تھی اور کہاں اُس کے آنسو اُمڈ آئے تھے۔ میں اس کی کہانی اُسی کے الفاظ میں سنا دیتی ہوں۔ آپ بھی اُس کے الفاظ میں لکھیئے گا۔ میں آہستہ آہستہ بولوں گی تاکہ آپ اس کا ہر لفظ اس طرح لکھ سکیں جس طرح اُس کی زبان سے نکلا تھا۔

"اگر تم مجھے پیار کی جھلک نہ دکھاتیں تو آج بھی میرے آنسو نہ نکلتے۔ مرد کی

آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ میں تم پر ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تمہاری خوبصورتی اور تمہاری جوانی نے ذرّہ بھر متاثر نہیں کیا۔ مجھے تمہاری بپتا نے اور تمہارے پیار نے متاثر کیا ہے۔ میں نے پہلے روز تم سے پوچھا تھا کہ آپ اکیلے گھوم پھر رہی ہیں، تو ہو سکتا ہے تم نے یہ سمجھا ہو کہ میں اس ملک کے نوجوانوں کی طرح تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے ہمکلام ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تمہاری عمر کی لڑکی مری کی مال کی رونق سے دُور ایسے ویرانے میں اکیلی نظر آتے تو اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ میں بھی اکیلا ہی گھوم پھر رہا تھا۔ میں بھی مری کی رونق سے بھاگا ہُوا وہاں پہنچا تھا۔ یہ میرے دل کی آواز تھی کہ تم سے پوچھوں کہ تم اکیلی کیوں ہو۔ میں دراصل تم سے پوچھنا یہ چاہتا تھا کہ وہ کون سا غم ہے جو تمہیں یہاں لے آیا ہے

"میرا خیال صحیح نکلا مگر میں فوجی ہوں اور ایک ذمہ دار فوجی ہوں۔ میں جب ایک عام انسان کے روپ میں آتا ہوں تو میرے جذبات مجھے پریشان کر دیتے ہیں مگر میں جب فوجی ہوتا ہوں تو اپنے جذبات کو کچل دیتا ہوں۔ تم نے میرے دونوں روپ دیکھ لئے ہیں۔ تم نے مجھے اپنی فطرت کا جو خلا دکھایا تھا وہ میری فطرت میں بھی موجود تھا۔ تمہاری محبت نے دونوں کے خلا پُر کر دیتے ہیں۔ یہی ایک خلا تھا جو میری بہت بڑی کمزوری بنا ہُوا تھا.... یہ خلا، یہ کمزوری، یہ تشنگی میری ماں کی موت نے مجھ میں پیدا کی تھی۔ میری عمر اُس وقت گیارہ سال اور کچھ مہینے تھی۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی تھا جس کی عمر پندرہ سال تھی۔ وہ تو بے چارہ ماں کی وفات کے سات ماہ بعد ہی فوت ہو گیا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ ماں کے پاس چلا گیا میں اکیلا رہ گیا۔ یہ دوسرا صدمہ تھا جو مجھے برداشت کرنا پڑا....

"میرا گھر بہت پیارا گھر تھا۔ وہاں محبت تھی، خوشیاں تھیں، ہنسی کھیل تھا۔ میرا باپ زندہ دل انسان تھا۔ میں اس ماحول میں پیدا ہوا اور پرورش پائی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جن گھروں میں پیار نہیں ہوتا وہاں بچّے زندہ کس طرح رہتے ہیں۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میں پانچ سال کی عمر میں سکول میں داخل ہو گیا تھا۔ جب پاکستان بنا تو میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے محلّوں میں ہندو دو دل

کے دس بارہ گھر تھے۔ وہ سب انڈیا چلے گئے۔ محلے کے مسلمانوں نے اُن کے گھروں سے سارا سامان اُٹھالیا۔ جس کے ہاتھ جو کچھ لگا اٹھا لے گیا۔ تھوڑے دنوں بعد یہ گھر آباد ہونے لگے۔ دوسری جماعت کے بچے کا شعور اتنا بیدار نہیں ہوتا لیکن ہندوؤں کے خالی مکانوں میں جو لوگ آکر آباد ہوئے، انہوں نے میرا شعور اسی عمر میں بیدار کر دیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے اور میں تمام عمر یاد رکھوں گا کہ یہ لوگ کس حال اور کس حلیے میں ہمارے محلے میں داخل ہوتے تھے۔ یہ انڈیا کے مہاجر تھے۔ اُن کے ساتھ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے رضا کار، پولیس کے دو تین باوردی آدمی اور شہر کے چند ایک آدمی تھے۔ انہیں ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانوں میں آباد کرنے کے لئے لایا گیا تھا۔۔۔

"گلی میں شور سا اُٹھا تو میں دوڑتا ہُوا باہر گیا۔ ایک قافلہ سا آرہا تھا۔ آگے آگے جو آدمی تھے ان میں سے ایک کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس کا ایک بازو سلنگ میں تھا۔ کلائی سے کندھے تک بازو پٹیوں میں جکڑا ہُوا تھا۔ اس کی ساری پٹیاں خون سے لال تھیں۔ دوسرے آدمی کے بھی سر پر پٹیاں تھیں اور اس کی دونوں ٹانگیں زخمی تھیں۔ اس سے اچھی طرح چلا نہیں جاتا تھا۔ ان کے پیچھے تین بچے میری عمر کے، تین ان سے چھوٹے جن میں دو بچیاں تھیں، ایک بچی کو دو بچوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ اُس کی قمیض پھٹی ہوئی اور خون سے لال تھی اور اس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے اُوپر پٹیوں میں تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ ان کے ساتھ چھ سات عورتیں تھیں۔ وہ سب رو رہی تھیں۔ صرف دو کے سروں پر دوپٹے تھے۔ ان سب کے بال مٹی سے اَٹے ہوئے تھے۔ چہرے لاشوں کی طرح سوکھ گئے تھے۔ ان کے ساتھ جوان لڑکیاں بھی تھیں جن کے چہرے دوپٹوں میں چھپے ہوتے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ چل نہیں سکتیں۔ وہ بھی رو رہی تھیں، ہچکیاں لے رہی تھیں۔ دو جوان آدمیوں کو دو آدمیوں نے پیٹھ پہ اُٹھا رکھا تھا۔ ان کی ہائے ہائے مجھے آج تک یاد ہے۔۔۔۔

"ان میں بوڑھے آدمی بھی تھے۔ ان کے پیچھے پھر عورتیں تھیں۔ بچے تھے۔ ایک عورت نے ایک بچہ سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس بچے کی عمر ایک سال سے کم ہوگی۔

بچے کے سارے سر پہ ماں نے اپنا دوپٹہ لپیٹ رکھا تھا اور دوپٹہ خون سے لال تھا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ بچہ مرا ہُوا تھا۔ سکھوں نے اس معصوم کا سر کرپانوں سے کھول دیا تھا۔ ماں مُردہ بچے کو اُٹھا لائی تھی۔۔۔۔ یہ قافلہ بہت ہی آہستہ آہستہ چیونٹی کی چال آرہا تھا۔ وہ عورت بین کرکے رو رہی تھی جس نے دُودھ پیتے بچے کی لاش اُٹھا رکھی تھی۔ باقی عورتیں بھی رو رہی تھیں اور مردوں کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ چہروں پر خوف تھا۔ محلے کے لوگ گھروں سے نکل کر اپنے دروازوں کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ عورتیں منڈیروں سے جُھک جُھک کر دیکھ رہی تھیں، اور مہاجروں کا یہ قافلہ ویران اور دہشت زدہ نظروں سے سب کو دیکھتا اور قدم گھسیٹتا گزرتا جا رہا تھا۔ یہ قافلہ ہندوؤں کے مکانوں میں تقسیم ہونے لگا اور پھر سارا قافلہ گلی سے غائب ہو گیا۔۔۔۔

"یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آتے ہیں میں نے اُسی وقت جان لیا تھا کہ یہ کہیں کے مظلوم لوگ ہیں، ظالموں نے، شاید ڈاکوؤں نے ان کے قافلے کو لوٹ لیا اور انہیں زخمی کرکے بھگا دیا ہے۔ اُس عمر میں مجھے اتنا ہی معلوم تھا کہ لوگوں پر ظلم کرنے والے صرف ڈاکو ہوتے ہیں۔ میں بچہ تھا۔ میرے اندر کوئی جذبہ تڑپ اُٹھا تھا جسے میں سمجھ نہ سکا۔ میں بہت ہی بے چین ہو گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے زخموں نے میرے دل کو زخمی کر دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ میں بڑا ہو کر طاقتور بنوں گا اور ڈاکوؤں کو ماروں گا۔۔۔۔

"شام کو جب میرا باپ گھر آیا تو میں نے ان لوگوں کے متعلق اس سے اتنے سوال پوچھے کہ وہ پریشان ہو گیا لیکن میری بے چینی اور میری ہیجانی کیفیت کو میرا باپ نظر انداز نہ کر سکا۔ اُس نے مجھے میرے سارے سوالوں کا جواب دیا۔ مجھے بتایا کہ یہ ملک جہاں ہم رہتے ہیں پاکستان ہے۔ پاکستان خدا رسولؐ اور قرآن کا ملک ہے۔ ہم چھوٹے چھوٹے بچے چاند ستارے والی سبز جھنڈیاں اٹھاتے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگایا کرتے تھے لیکن یہ ہمارا کھیل تھا۔ ہم بڑوں کے جلوس دیکھا کرتے تو ان کی نقل کیا کرتے تھے۔ ہم ابھی پاکستان کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ میرے باپ نے جب مجھے بتایا کہ انڈیا کے ہندوؤں اور سکھوں نے

مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا، جلایا اور انہیں قتل کیا ہے اور یہ لوگ جو ہمارے محلّے میں ہندوؤں کے مکانوں میں آتے ہیں، انڈیا سے جانیں بچا کر آتے ہیں تو مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے میرے جسم کے اندر ایک شعلہ بھڑکا ہے اور میں جل گیا ہوں۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ میں نے اُس کا چہرہ دیکھا جس پر غصے اور ہیجان کا رنگ آگیا تھا۔ اُس نے مٹھیاں بند کر لیں اور وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہُوا تھا۔ صوفے پر گھونسہ مار کر اس نے دانت پیس کر کہا۔ "ہندوؤں اور سکھوں نے ان ننھے بچوں کو زخمی کیا تھا۔ انہوں نے دودھ پیتے بچوں کو قتل کیا تھا۔ زبی! میں بہت چھوٹا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں بڑوں کی باتیں سمجھ بھی نہیں سکتا تھا مگر مجھ میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا کہ میں ہندوؤں اور سکھوں سے انتقام لے سکتا ہوں اور میں سب کچھ سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ ہمارے محلّے کے ہندو اور سکھ بڑے آرام سے یہاں سے چلے گئے تھے۔ ہمارے محلّے کے مسلمانوں نے اُن کے ساتھ معمولی سی بدسلوکی بھی نہیں کی تھی۔ پھر ہندوؤں اور سکھوں نے انڈیا میں انہیں کیوں قتل کیا ہے؟ انہیں زخمی کر کے وہاں سے کیوں نکالا ہے؟"

وہ مجھے کوئی نئی بات نہیں سنا رہا تھا۔ اس نے مہاجروں کو پاکستان میں دیکھا تھا اور میں وہ مہاجر تھی جو ہندوؤں اور سکھوں کی درندگی کا شکار ہو کر آئی تھی۔ وہ دانت پیس پیس کر بول رہا تھا اور میں سُن رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میرے محلّے والوں نے مہاجرین کی بہت خاطر تواضع کی۔ انہیں برتن، بستر اور کپڑے دیئے اور بہت دنوں تک ہمارے گھروں سے ان کے گھروں میں کھانا دانہ جاتا رہا۔ ان کے بچے ہم میں گھُل مل گئے۔ کچھ ہمارے سکول میں داخل ہوئے۔ ہم مقامی بچے ان سے پوچھا کرتے تھے کہ انڈیا میں ان پر کیا گزری ہے تو وہ ایسے ایسے واقعات سناتے تھے کہ ہم ڈر جاتے تھے۔ ابتدا میں مہاجر بچوں کا یہ حال تھا کہ ان سے ہم پوچھتے کہ انڈیا سے وہ کس طرح آتے ہیں تو خوف سے کسی بچے کی چیخ نکل جاتی تھی۔ کوئی بچہ رو پڑتا تھا اور جو بچے ذرا دلیر تھے وہ التجا کرتے تھے کہ نہ پوچھو، ہم پر جو گزری ہے وہ سنائی نہیں جا سکتی....

"تم بھی زبی اسی عمر میں انڈیا سے آئی تھیں نا! تم نے مجھے ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کے جو واقعات سنائے تھے اس سے زیادہ دہشت ناک واقعات ہمیں ان بچوں نے سنائے۔ ایک بچے نے بتایا کہ سکھ اس کے سامنے اس کی جوان بہن کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ ہر بچے کے گھر کے دو تین فرد قتل ہو گئے تھے۔ تین بچے ایسے تھے جن میں سے دو کے دُودھ پیتے بھائیوں کو جلتے مکان کے شعلوں میں سکھوں نے زندہ پھینک دیا تھا۔" بولتے بولتے وہ چُپ ہو گیا اور اچانک بم کی طرح پھٹ کر بولا۔ "دُودھ پیتے بچوں کو زبی! ہمارے بچوں کو انڈیا کے کافروں نے آگ میں پھینکا تھا۔" اُس نے اپنی ہتھیلی پر گھونسہ مار کر کہا۔ "میں نہیں بھول سکتا۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں جس فوج کا کیپٹن ہوں وہ فوج نہیں بھول سکتی کہ انڈیا والوں نے ہمارے ننھے ننھے بچوں کو آگ میں پھینکا تھا۔ بچوں کے سر کرپانوں اور برچھیوں سے کھول دیتے تھے۔ ہماری جوان بہنوں کو سکھ اُٹھا کر لے گئے تھے۔ امرتسر کے بازار میں مسلمان لڑکیوں کو ننگا کر کے جلوس کی شکل میں پھرایا گیا تھا۔"

اُس کی آواز اس قدر غصیلی اور اتنی بلند ہو گئی تھی کہ میں ڈرنے لگی کہ کوئی یہ سمجھ کر اندر نہ آجائے گا کہ اندر لڑائی ہو رہی ہے۔ وہ خود مہاجر نہیں تھا مگر مہاجروں نے اُسے دیوانہ کر دیا تھا۔ اُس کے جذبات کا یہ اُبال دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ اُس کی اتنی پیاری آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ مجھے بڑی شدت سے اپنی ہجرت یاد آگئی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "اسی عمر میں مجھ میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ میں اس جذبے کی بنیاد پر بڑا ہونے لگا.... میں ساتویں جماعت میں پہنچا تو ہم سب بچے سیانے ہو گئے تھے۔ ایک روز ایک مہاجر ہم جماعت نے مجھے اپنی ہجرت کی کہانی سنائی۔ اُن کے قافلے پر سکھوں نے حملہ کیا تھا اور بے شمار مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ بچے فصلوں میں چھپ گئے تھے۔ بعض عورتوں کی سکھوں نے وہیں آبروریزی شروع کر دی تھی۔ اچانک پاکستان کی طرف سے بہت سے فوجی ٹرک آگئے۔ ان میں سے فوجی اُترے جنہوں نے سکھوں پر گولیاں چلانا شروع کر

دیں۔ بعض سپاہیوں نے سکھوں کو سنگینوں سے مارا۔ سکھ جو بھاگ اُٹھے تھے ان پر فوجیوں نے مشین گنیں فائر کیں اور جو مہاجر سکھوں سے بچ گئے تھے، انہیں فوجی ٹرکوں میں بھر کر پاکستان لے آئے ....

"یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ پاک آرمی کی ایک بلوچ رجمنٹ تھی جو مہاجرین کو اپنی حفاظت میں انڈیا سے لائی تھی۔ یہ رجمنٹ بہت مشہور ہوتی تھی۔ ساتویں جماعت میں جب میں نے سُنا کہ ہمارے فوجیوں نے مہاجرین کی مدد کی اور ان کے خون کا انتقام بھی لیا تھا تو میں نے اُسی وقت اپنے آپ کو خاکی وردی میں دیکھنا شروع کر دیا۔ پڑھنے کا شوق پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ یہ شوق بڑھانے میں میرے باپ کا زیادہ ہاتھ تھا۔ میں اُس سے انڈیا، ہندوؤں اور سکھوں کی باتیں پوچھتا رہتا تھا اور باپ سے کہا کرتا تھا کہ میں فوجی بنوں گا۔ باپ کو مجھ سے بہت پیار تھا۔ وہ میری حوصلہ افزائی کیا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ بیٹا! خوب دل لگا کر پڑھو۔ پھر تم فوجی افسر بنو گے۔ اس نے میرے ذہن میں بٹھا دیا تھا کہ ہندو اور سکھ ہمارے بڑے پرانے دشمن ہیں اور وہ ہمارے ملک کو فتح کر کے انڈیا میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ میں ہندوؤں اور سکھوں کو کُتوں سے بدتر سمجھنے لگا اور آج بھی انہیں کُتوں جیسا درجہ دیتا ہوں ....

"مگر زیبی! وہی باپ جو مجھے بتایا کرتا تھا کہ ہندو تمہارا دشمن ہے، وہ خود میرا دشمن بن گیا۔ یہ انقلاب اس طرح آیا کہ میری ماں بیمار ہوئی اور بیماری کے بیسویں روز مر گئی۔ میرے لئے پیار مر گیا، میرا بچپن مر گیا اور میں خلاؤں میں ماں کو ڈھونڈتا پھرا۔ میں روتا، میری ہچکی بندھ جاتی تھی۔ باپ مجھے سینے سے لگا لیتا تھا۔ اُس نے میرے لئے ماں کا خلا پُر کرنے کی بہت کوشش کی مگر ماں کا نعم البدل ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میرے بڑے بھائی کی عمر پندرہ سال تھی۔ اس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ روتا بھی نہیں تھا اور بولتا بھی نہیں تھا۔ ایسا ہنس مکھ اور ناچنے کُودنے والا لڑکا ہر وقت خاموش رہنے لگا۔ میں روتا تو وہ مجھے گلے لگا لیتا تھا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتا رہتا تھا مگر بولتا نہیں تھا۔ کبھی کبھی میرا مُنہ چُوم لیتا تھا ....

"اس خاموشی سے چھ مہینے گزر گئے۔ وہ سُوکھ کر لاش بن گیا تھا۔ باپ نے اسے طاقت کی بہت دوائیاں پلائیں۔ ڈاکٹروں کو بھی دکھایا مگر ماں کے صدمے کا علاج کوئی ڈاکٹر نہ کر سکا۔ ایک صبح وہ چارپائی سے اُٹھا ہی نہیں، آنکھیں کھولے ہمیں دیکھتا تھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ چہرے پر درد کا یا تکلیف کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ باپ نے اسے اُٹھانے کی بہت کوشش کی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے ایک انجکشن دیا مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ محلے کی عورتیں اور ہمارے رشتے برادری کی عورتیں ہمارے گھر میں آئی ہوئی تھیں۔ میں دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اندر سے مجھے اپنے باپ کی دھاڑیں سنائی دیں۔ فوراً ہی عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں دوڑ کر اندر گیا۔ عورتوں نے میرے بھائی کی چارپائی پر جھمگٹا کر رکھا تھا۔ میں اس جھمگٹے سے گزرتا آگے ہُوا۔ ایک عورت میرے بھائی کی آنکھیں بند کر رہی تھی۔ میرا بھائی ختم ہو چکا تھا۔"

اُس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بولنے کی کوشش کی، مگر آواز نہ نکل سکی۔ پھر وہ ہچکیاں لینے لگا اور صوفے سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ باہر اندھیرا تھا۔ وہ کچھ دیر اندھیرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے رومال سے آنکھیں پونچھیں، میری طرف گھوما اور کہنے لگا۔ "میں کسی عورت کے سامنے نہیں رونا چاہتا تھا لیکن زیبی! تم نے مجھے ایسا پیار دیا ہے جس نے مجھے ماں کے پیار کا کیف دیا ہے۔ شاید اسی کا اثر ہے کہ آنسو بند توڑ کر نکل آتے ہیں۔"

"ان آنسوؤں کو نکل جانے دو۔" میں نے کہا۔ "میں نے بھی آنسو روکے تھے مگر یہ انگارے بن کر مجھے جلانے لگے تھے۔"

"میری زندگی تین چیزوں تک محدود ہو گئی۔ گھر، سکول اور قبرستان۔" اس نے کہا۔ "گھر سے تو مجھے وحشت ہوتی تھی۔ باپ مجھے تنہا نہیں رہنے دیتا تھا مگر اس کی ساری کوششیں ناکام تھیں۔ میں ماں اور بھائی کو بھول نہیں سکتا تھا۔ میں روتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ صبر کسے کہتے ہیں اور جبر کیا ہوتا ہے ....

میں کسی کا بیٹا نہیں

"سات آٹھ مہینوں بعد باپ نے دوسری شادی کر لی۔ شادی بھی ایک جوان لڑکی سے کی۔ شادی کے بعد میرے گھر میں وہی ڈرامہ شروع ہو گیا جو تم نے ایک ہزار بار سنا ہوگا۔ سوتیلی ماں ہماری سوسائٹی کا ایسا کردار ہے جس سے کوئی بھی ناواقف نہیں۔ میری سوتیلی ماں میں کوئی ایسی کشش نہیں تھی کہ دیکھنے والے اس پر جان چھڑکتے۔ عام سی لڑکی تھی لیکن اپنے آپ کو بہت خوبصورت سمجھتی تھی۔ یہ ایک خرابی تھی۔ دوسری خرابی میرے باپ کے اس احساس نے پیدا کی کہ وہ لڑکی سے اٹھارہ بیس سال بڑا تھا اور اُس کے مقابلے میں اپنے آپ کو بوڑھا سمجھتا تھا۔ باپ نے پہلے دن مجھے بڑے پیار سے کہا کہ بیٹا، دیکھو میں تمہارے لئے نئی امی لایا ہوں۔ میرے دل نے پہلے دن ہی اسے قبول نہ کیا۔ میں ہر بچے کی طرح اپنی ماں کو دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت اور پیاری عورت سمجھتا تھا۔ سوتیلی ماں نے بیگانوں کی طرح میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اُس نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ....

"تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے میرے باپ پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہی باپ جو گھر آ کر مجھے سینے سے لگا لیتا تھا، اب باہر سے آتا تو اپنی نئی بیوی کے پاس جا بیٹھتا۔ میں اس کے پاس جا کھڑا ہوتا تو وہ عادت کے مطابق مجھ سے رسمی سا پیار کرتا۔ جُوں جُوں دن گزرتے گئے یہ رسم بھی ختم ہوتی گئی۔ ایک روز میں ان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ایک ہی پلنگ پر بیٹھے انگور کھا رہے تھے۔ سوتیلی ماں نے انگوروں کے چند دانے مجھے دے کر کہا 'جاؤ کھیلو۔' زیبی! میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میرے اندر کیسا دھماکہ ہُوا۔ میں نے انگور نہ لیا اور وہاں سے ہلا بھی نہیں۔ باپ نے مجھے کہا 'جاؤ نا یہاں سے۔ جاؤ کھیلو۔' میں انگور لئے

بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔ دماغ میرے قابو سے نکل گیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا گھر سے نکلا اور چلتا ہی گیا۔ دماغ اور دل پر اس قدر غم بیٹھ گیا تھا کہ میں کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ حلق میں کوئی چیز اٹک گئی تھی ....

"چلتے چلتے، بغیر کسی ارادے اور سوچ کے میں ماں کی قبر تک جا پہنچا۔ وہاں میرا ذہن بیدار ہو گیا۔ ماں کی قبر دیکھ کر میں بے قابو ہو کر رونے لگا اور روتے روتے ماں کی قبر پر لیٹ گیا۔ وہیں آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں اتنی دیر تک کبھی باہر نہیں رہا تھا۔ میں دوڑتا ہوا گھر چلا گیا۔ باپ نے مجھے ڈانٹ کر پوچھا کہ کہاں تھے؟ میں نے بتا دیا کہ ماں کی قبر پر چلا گیا تھا۔ باپ نے کچھ بھی نہ کہا۔ البتہ سوتیلی ماں بولی۔ 'اتنی دیر ماں کی قبر پر کیا قرآن پڑھتا رہا ہے؟ میں نے پرسوں بھی آپ کو بتایا تھا کہ یہ بچہ آوارہ ہوتا جا رہا ہے۔ جھوٹ بھی بولتا ہے۔' میں جھوٹ کا الزام سننے کے لئے تیار نہیں تھا کیونکہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں بچہ تھا۔ تحمل اور برداشت کا مادہ کم تھا۔ میں نے غصے میں کہا۔ 'جھوٹ تم بولتی ہو۔ مجھے بتاؤ میں نے کب جھوٹ بولا ہے؟' ....

"سوتیلی ماں نے رو دھو کر میرے باپ سے کہا۔ 'دیکھا آپ نے؟ آپ باہر چلے جاتے ہیں تو یہ میرے ساتھ اسی طرح بدتمیزی کرتا رہتا ہے۔' باپ جانتا تھا کہ میں ایسا بدتمیز نہیں ہوں لیکن اُس نے بڑی زور سے میرے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ یہ میرے باپ کا پہلا تھپڑ تھا۔ اس کے بعد باپ کے تھپڑ روزمرہ کا معمول بن گئے۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ سوتیلی ماں کو میرے ساتھ کیا عداوت تھی۔ بڑے ہو کر اس سوال کا جواب ملا۔ عداوت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اس کا کچھ نہیں لگتا تھا اور سب سے بڑی وجہ میرے باپ کی تھوڑی سی جائیداد اور یہ مکان تھا۔ سوتیلی ماں اپنے بچوں کو اس کا مالک بنانا چاہتی تھی۔ اس کا طریقہ یہی تھا کہ میرے لئے یہ گھر جہنم بنا دے اور میرے باپ کو میرا دشمن بنا دے تاکہ میں گھر سے بھاگ جاؤں یا باپ مجھے جائیداد سے عاق کر دے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ اس کی سکیم پوری طرح کامیاب رہی ....

"جہنم میں شاید کچھ سکون مل جاتا ہو گا۔ میرے گھر میں کوئی سکون نہ رہا۔ سوتیلی

ماں میرے باپ کے اعصاب اور دماغ پر چھا گئی۔ مجھے سوتیلی ماں نے گھر کا نوکر بنا دیا۔ میری برخورداری کا یہ عالم تھا کہ میں نے گھر میں جھاڑو بھی دیا اور برتن بھی دھوتے اور جب سوتیلی ماں کا پہلا بچہ پیدا ہوا تو میں نے اس کے غلیظ کپڑے بھی دھوتے۔ اگر مجھے پیار سے محروم نہ کیا جاتا تو میں نوکروں کے یہ سارے کام بڑی خوشی اور دلچسپی سے کرتا رہتا لیکن مجھے ایسے نوکر کا درجہ دے دیا گیا تھا جو کام چور ہو اور جو ڈانٹ ڈپٹ، مار پٹائی اور گالیوں کے بغیر کام نہ کرتا ہو۔ میرے ذہن میں اپنی ماں کی یاد روز بروز تازہ ہوتی جا رہی تھی اور پیار کی تشنگی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ ان حالات میں بھی میرے دل سے پڑھنے کا شوق نہیں نکلا۔ میں نے اپنی طرح کے بچے دیکھے ہیں جو ماؤں کے مرنے کے بعد سوتیلی ماؤں کے ہاتھوں تنگ آ کر آوارہ ہو گئے۔ ان میں سے بعض عادی مجرم بن گئے لیکن میں نے سکول اور کتابوں میں پناہ ڈھونڈ لی اور ظلم و تشدد سہتے سہتے دس جماعتیں پاس کر لیں۔ میں نے تمہیں سارے واقعات نہیں سنائے ورنہ دو دن سناتا رہوں تو میری کہانی ختم نہ ہو....

"میں کالج میں داخل ہونا چاہتا تھا لیکن سوتیلی ماں نے اجازت نہ دی۔ لہٰذا باپ نے بھی صاف جواب دے دیا اور کہا کہ کہیں نوکری تلاش کرو۔ میں نے یہ نادر شاہی حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ باپ نے مجھے مارا پیٹا۔ سوتیلی ماں نے دانشمندوں کی طرح مجھے پند و نصیحت کی کہ دیکھو تمہارا باپ بوڑھا ہو گیا ہے، اب نوکری کرو اور باپ کا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ دونوں یہ تو سوچ ہی نہیں رہے تھے کہ سولہ سال کی عمر میں مجھے کہاں نوکری مل سکتی ہے۔ اس مسئلے پر گھر میں خوب ہنگامہ ہوا۔ ایک روز سوتیلی ماں گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے مجھے نوکری تلاش کرنے کو کہا تو میں نے ان الفاظ میں اسے اپنا فیصلہ سنایا۔ 'غور سے سُن لو۔ میں بار بار یہ بات نہیں کہوں گا۔ تم مجھے حکم نہ دو۔ میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ میں اس گھر سے چلا جاؤں گا۔ مجھے جس باپ کا سہارا بننے کو کہہ رہی ہو وہ میرا باپ نہیں، تمہارا خاوند ہے۔ آج شام جب اس کے سامنے میری شکایت پیش کرو تو اسے یہ بھی بتا دینا کہ یہ لڑکا اب جوان ہو گیا ہے۔ اب اس پر ہاتھ اُٹھایا تو وہ تمہارا ہاتھ توڑ دے گا'....

"یہ کمبخت عورت ڈر گئی۔ میں نے اسے کہا، مجھے مجبور نہ کرو کہ تم دونوں سے اپنا حق چھین لوں۔ تم نے میری ماں کی جگہ لی ہے۔ میری ماں کے کپڑے پہنے ہیں۔ میری ماں کے زیورات کی مالک بن بیٹھی ہو۔ میرے مکان میں رہتی ہو اور دھونس مجھے دکھاتی ہو۔ میں اسے حیران اور پریشان چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ میری خالہ تھی۔ بڑی ہی پیاری عورت تھی۔ خالو تو بے نظیر انسان ہے۔ انہوں نے مجھے کتنی بار کہا تھا کہ میں ان کے پاس رہوں لیکن اپنی ماں کی چار دیواری سے میں نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ میں خالہ کے پاس چلا گیا۔ خالو گھر تھا۔ میں نے انہیں یہ بات سنائی۔ دونوں نے کہا کہ اگر یہ لوگ تنگ کریں تو ہمارے پاس آجانا۔ وہاں سے مجھے حوصلہ ملا....

"میں ٹہلتے ٹہلتے ذرا دُور نکل گیا۔ ایک میدان میں دو ٹیمیں فٹ بال کھیل رہی تھیں، اور ذرا پرے چند ایک نوجوان ورزش کر رہے تھے۔ ان کے پاس ویٹ تھے، ڈمبل تھے اور ورزش کا بہت سارا سامان تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ یہ کلب تھا۔ میرے ذہن میں بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ میں نے فوجی بننے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کلب کی ممبر شپ لے لی اور وہاں ورزش کے لئے جانے لگا۔ فٹ بال بھی کھیلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کلب کے ایک ممبر سے راہنمائی لے کر ایف۔ اے کی پرائیویٹ تیاری شروع کر دی۔ ایک سال گزر گیا۔ میری عمر سترہ سال سے تین چار مہینے اوپر ہو گئی تھی۔ گھر میں باپ کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ سوتیلی ماں کو میں نے اپنے رعب میں لے لیا تھا۔ وہ اب مجھ پر حکم نہیں چلاتی تھی لیکن ڈھنگ مارنے سے بھی باز نہیں آتی تھی۔ میں نے گھر کے کام کاج چھوڑ دیئے تھے۔ باپ کے ساتھ بول چال بند ہو گئی تھی۔ بول چال ہوتی تھی تو جھگڑا ہوتا تھا....

"ایک روز میں نے سوتیلی ماں سے پانچ روپے مانگے۔ اس نے روپے دینے کی بجائے طعنہ دیا۔ میں نے اسے اس سے زیادہ بیہودہ طعنہ دیا۔ باپ دوسرے کمرے میں تھا۔ اسے سنانے کے لئے اور اُسے بھڑکانے کے لئے سوتیلی ماں نے رونا شروع کر دیا اور گالیاں بھی بکنے لگی۔ باپ دوڑتا باہر آیا۔ سوتیلی ماں نے یہ جھوٹ بولا کہ تمہارے اس بدمعاش بیٹے نے مجھے ننگی گالیاں دی ہیں۔

میں باؤلا ہو گیا۔ میری جسم میں اب طاقت تھی۔ میں نے سوتیلی ماں کے مُنہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ وہ چکرا کر دروازے کے ساتھ لگی اور گر پڑی۔ باپ میرے پیچھے تھا۔ اس نے میرے سر کے بال مٹھی میں لے لئے اور اپنی طرف گھُما کر زناٹے دار تھپڑ میرے مُنہ پر مارا۔ میں بھول چکا تھا کہ وہ میرا باپ ہے جس طرح تم نے کہا تھا کہ میں کسی کی بیٹی نہیں اسی طرح میں نے بھی اپنے دل کو یہ کہہ کر مضبوط کر لیا تھا کہ میں کسی کا بیٹا نہیں۔ میں نے پوری طاقت سے ایک گھونسہ باپ کے مُنہ پر مارا۔ یہ ایک جوان آدمی کا گھونسہ تھا جس نے ایک سال ورزش کی تھی اور اس گھونسے میں اور اس تھپڑ میں جو میں نے سوتیلی ماں کے مُنہ پر مارا تھا، پانچ برسوں کا غصہ اور انتقام بھرا ہُوا تھا....

"سوتیلی ماں فرش پر لیٹی ہوئی چیخ چلّا رہی تھی۔ اس کے دو بچے رو رہے تھے اور باپ کو میں نے دیکھا۔ وہ اٹھ رہا تھا۔ اس نے کہا، میں ابھی تمہیں حوالات میں بند کراتا ہوں۔ میں چپ چاپ تھا۔ میرے ہاتھ، میرے ہونٹ اور میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔"

بولتے بولتے اُس کی آواز رقت میں دب گئی۔ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "میں نے اپنے باپ کو مارا تھا۔ اپنے باپ کو.... زبی! کبھی کبھی ویسا ہی گھونسہ جیسا میں نے باپ کو مارا تھا میرے ضمیر پر پڑنے لگتا ہے اور گناہ کا احساس میرا بُرا حال کر دیتا ہے۔ باپ پر ہاتھ اُٹھانا بہت بڑا گناہ سمجھتا ہوں مگر جب یاد آتا ہے کہ باپ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا تو سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کیا وہ ٹھیک ہی کیا تھا۔" اُس نے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور آہ بھر کر کہنے لگا۔ "اب اس گھر میں رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں گھر سے نکلا۔ تھوڑی دُور تک مجھے سوتیلی ماں کی چیخ و پکار اور گالیاں اور اس کے بچوں کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ محلے کی چند ایک عورتوں کو دیکھا وہ میرے گھر کی طرف دوڑی جا رہی تھیں۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا گلی سے نکل گیا۔ خالہ کے گھر گیا اور اُسے بتا دیا کہ میں کیا کر آیا ہوں۔ اُسے وجہ بھی بتائی اور اسے کہا کہ مجھے کچھ پیسے دے دے میں کہیں نوکری کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ خالہ نے مجھے جانے سے روکا، اور کہا کہ میں اس کے پاس رہوں لیکن

میں نہ مانا۔ خالہ نے مجھے پچاس روپے دیئے اور میں صرف ایک شلوار قمیض میں اپنے شہر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا....

"میرا دماغ میرے قابو سے باہر تھا۔ جذباتی حالت آگ کے شعلوں کی مانند تھی۔ کبھی میرے آنسو نکل آتے اور کبھی غصہ آجاتا۔ وہ صدر ایوب کے مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ میں نے سنا تھا کہ فوجی حکومت ہر کسی سے انصاف کرتی ہے۔ میں نے اس ارادے سے راولپنڈی کا ٹکٹ لے لیا کہ صدر ایوب خان کے پاس جاؤں گا، اور اسے جا کر کہوں گا کہ ایک سوتیلی ماں نے مجھے تمہاری حکومت میں جائیداد سے، میرے باپ سے اور میرے باپ کے پیار سے محروم کر دیا ہے۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں مگر مجھے گھر کا نوکر بنایا جا رہا ہے۔ یہ جاہلانہ ارادہ تھا۔ اُن دنوں ہر آدمی اسی انداز سے سوچا کرتا تھا۔ میں نے بھی وہی کچھ سوچا اور راولپنڈی جانے والی گاڑی پر بیٹھ گیا....

"اس ڈبے میں چار فوجی بیٹھے ہوتے تھے۔ ان میں ایک نائک تھا۔ میں اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ میرا ذہن فوراً بچپن میں جا پہنچا جب میں نے مہاجرین کے بچوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ہندوؤں اور سکھوں سے انتقام لوں گا۔ مجھے کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا اور دماغ ٹھکانے آگیا۔ میں نے ان فوجیوں کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ باتیں کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ خدا نے جسم بھی اچھا دیا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں اور انہیں یہ بھی بتایا کہ میں صرف نوکری نہیں چاہتا۔ میرے اندر ایک جذبہ ہے۔ میں نے انہیں اپنے بچپن کی باتیں سنائیں اور مہاجروں کے بچوں کے متعلق بتایا۔ ان فوجیوں میں دو مہاجر تھے۔ وہ میری باتوں سے متاثر ہوتے۔ نائک نے کہا 'تم سپاہی رینک میں کیوں بھرتی ہو گے؟ کوشش کرو اور سیدھا کمیشن کے لئے جاؤ'....

"مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ فوج میں داخل ہونے کے کون کون سے راستے ہیں۔ میں نے اُن سے راہنمائی کے لئے دو چار باتیں پوچھیں تو انہوں نے بتایا کہ کمیشن کا امتحان قابلیت سے بھی پاس کیا جا سکتا ہے اور سفارش کے زور پر بھی۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میں گھر سے بھاگا ہوا ہوں۔ انہیں ساری بات سنا

دی۔ میرے لب و لہجے میں ڈر، خوف، جھجک اور التجا نہیں تھی۔ میں خود اعتمادی سے اور دلیری سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میں صدر ایوب کے پاس جا رہا ہوں۔ اسی کو ساری کہانی سناؤں گا....

"وہ ہنس پڑے اور مجھے بتایا کہ صدر ایوب تک رسائی ناممکن ہے۔ راولپنڈی پہنچنے تک وہ چاروں میرے دوست بن چکے تھے۔ سٹیشن سے باہر آنے لگے تو نائک نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اتفاق دیکھو کہ وہ نائک اب میری بٹالین میں حوالدار میجر ہے۔ تم شاید ان عہدوں کو نہیں سمجھتیں۔ وہ میرا ماتحت ہے۔ یہ سن کر میرا راولپنڈی میں کوئی ٹھکانہ نہیں، اس نے مجھے کہا کہ ریلوے سٹیشن کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے عام سے ہوٹل ہیں وہاں رات گزارو اور کل میرے پاس آ جانا۔ اس نے مجھے اپنا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا اور وہ چاروں چلے گئے....

"وہ ہوٹل کیا تھا: نانبائیوں کی دکانیں تھیں۔ انہوں نے دکانوں کے سامنے چارپائیاں ڈال رکھی تھیں۔ میں نے ایک دکان پر روٹی کھائی اور سڑک کے کنارے چارپائی پر سو گیا۔ صبح ناشتہ کیا اور چھاؤنی چلا گیا۔ راہ جاتے لوگوں کو نائک کی بارکوں کا پتہ دکھاتا اور راستہ پوچھتا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ تم زیبی! فوجیوں کو نہیں جانتی۔ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اور زبان کے پکے۔ اس نے میری خاطر تواضع کی اور اپنے صوبیدار میجر کے پاس لے گیا۔ یہ صوبیدار میجر اس کا دُور پار کا رشتہ دار تھا۔ نائک نے اسے میرے متعلق ساری باتیں بتا کر کہا کہ مجھے کمیشن کے امتحان میں بٹھا دے۔ صوبیدار میجر نے اپنے کسی افسر سے بات کی اور مجھے بھرتی دفتر بھجوا دیا۔ آگے میری محنت تھی کہ مجھ میں کتنی کچھ قابلیت ہے....

"تین روز بعد مجھے ٹیسٹ کے لئے بلایا گیا۔ پھر ایک میجر نے انٹرویو لیا۔ اُس نے سوال تو وہی کئے جو وہ ہر امیدوار سے کرتا ہو گا لیکن میں نے اپنے سینے کا سارا غبار اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی ایک بات کو میں نے ہمیشہ ذہن میں رکھا۔ اس نے کہا۔ 'دیکھو لڑکے! میں نے تمہاری ساری باتیں سنی ہیں لیکن اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرو۔ تمہارے رویے میں جذباتیت بہت زیادہ

ہے۔ فوجی لحاظ سے یہ خامی ہوتی ہے۔ ہمیں جذبہ چاہیئے۔ جذباتیت سے بھرا ہُوا جوش وخروش نہیں چاہیئے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو جسے ہم ڈسپلن کہتے ہیں۔ فوج کے لئے ایسا آدمی نقصان دہ ہوتا ہے جس کے راستے میں کنواں آ جاتے تو وہ فرض کی ادائیگی کے جوش میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔ فوج اُس آدمی کو پسند کرتی ہے جو کنوئیں سے چھلانگ کر آگے نکل جاتے یا کوئی اور راستہ اختیار کرے ....

"اُس کی اِس نصیحت نے میری بہت مدد کی۔ میں نے یہ ٹیسٹ تو پاس کر لیا مگر سیلیکشن بورڈ کی کال آنے تک مجھے راولپنڈی میں بڑا ہی تکلیف دہ اور لمبا انتظار کرنا پڑا۔ تین چار روز نانبائی کی دکان پر گزارتا اور تین چار روز نانک کا مہمان رہتا۔ ایسے ہی وقت گزار لیا اور نانک کی معرفت مجھے کال آگئی۔ میں نے اسی کا پتہ دیا تھا۔ سیلیکشن بورڈ کے ٹیسٹ عجیب وغریب اور سخت تھے۔ وہاں دماغی بھرتی کی بھی ضرورت تھی اور جسمانی بھرتی کی بھی۔ اللہ نے کرم کیا کہ میں پورا اُترا۔ جب سیلیکشن بورڈ کے پریذیڈنٹ سے انٹرویو ہوا تو میں نے اسے اپنی زندگی کی ساری داستان سنا ڈالی۔ بہرحال میں منتخب ہو گیا۔ چوبیس امیدواروں میں سے ہم صرف تین لڑکے منتخب ہوتے ....

"کاکول اکیڈمی میں گئے تو پھر میرے لئے کوئی مشکل نہ رہی۔ ٹریننگ اس قدر سخت تھی کہ بعض کیڈٹ جو امیر گھرانوں کے شہزادے تھے، رو پڑتے تھے لیکن مجھے اس ٹریننگ میں روحانی سکون ملتا تھا۔ میں نے مطالعہ بھی جاری رکھا اور جسمانی لحاظ سے اپنے آپ میں گھوڑے اور بندر کے اوصاف پیدا کر لئے۔ میری کوئی اور دلچسپی نہیں تھی۔ میں منزل پر پہنچ گیا تھا۔ ٹریننگ کے دوران مجھے باپ بہت یاد آیا۔ ماں کی یاد تو ذہن میں ہر لمحہ موجود رہتی تھی۔ ایک روز میں نے باپ کو خط لکھا اور اسے خوشخبری سنائی کہ میں فوج میں افسر بننے والا ہوں اور اگر اس نے مجھے معاف کر دیا ہو تو میں ٹریننگ کے بعد گھر آؤں گا۔ اس نے بڑا ہی تلخ جواب دیا۔ اس کا جواب پڑھ کر پتہ چل رہا تھا کہ میری سوتیلی ماں بول رہی ہے۔ باپ نے لکھا تھا کہ اس کے گھر میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں اور اس نے ان الفاظ میں خط

ختم کیا تھا: میرے لئے تم مر گئے ہو!...

"اُس نے ٹھیک لکھا تھا۔ اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ میں اب قوم کا بیٹا تھا مگر یہ بھی یہ صرف جذبہ تھا۔ میں نے تنہائی میں کئی بار محسوس کیا کہ صرف جذبہ انسان کو صرف زندہ رکھ سکتا ہے مگر پیار اور محبت کے بغیر زندگی کوئی زندگی نہیں۔ کاکول میں کیڈٹوں کے باپ انہیں ملنے آتے تھے۔ مائیں بھی آتی تھیں، بہنیں بھی آتی تھیں لیکن میرا کوئی نہیں آتا تھا۔ میرے اندر خلا پیدا ہوتا چلا گیا۔ وہی خلا جو تم نے اپنی فطرت میں محسوس کیا تھا۔ اس سے توجہ ہٹانے کے لئے میں فوجی ٹریننگ میں محو ہو جاتا تھا...

"اللہ نے مجھے وہ دن دکھایا کہ ٹریننگ ختم ہو گئی۔ میں چند دن ایک ہوٹل میں چھٹی گزار کر اپنی رجمنٹ میں چلا گیا۔ اس کے بعد میں کہاں گیا، کیا ہُوا اس سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے۔ کسی کے ساتھ میری گہری دوستی نہیں، کوئی بھی میرے ماضی سے واقف نہیں۔ ہر کسی کے ساتھ ہنستا کھیلتا ہوں لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں اندر سے جلا ہُوا ہوں۔ میری نظریں صرف انڈیا پر لگی ہوتی ہیں۔ ایک صدمہ گزر چکا ہے۔ رن کچھ میں جنگ ہوتی مگر میری رجمنٹ کو وہاں نہ بھیجا گیا۔ جنگ ختم ہو گئی تو ہمیں بتایا گیا کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوتی۔ تیار رہو۔ میں تیار ہوں ...!" اس نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگا۔" ایک بج رہا ہے۔ میں نے اتنی باتیں کبھی نہیں کی تھیں"

شادی، فرض اور ساڑھے چھ ہزار روپیہ

میں نے پُرسکون سی آہ بھر کر کہا۔" اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگر پسند کرو تو ہم جلدی شادی کر لیں۔"

"کر لیں گے لیکن جلدی نہیں۔" اُس نے کہا۔" تمہارے ساتھ شادی کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میرا ایک مشن ہے وہ پورا ہو جانے دو۔"

"کیسا مشن؟"

"یہ نہیں بتا سکوں گا۔" اس نے جواب دیا۔" میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اپنے رینک کے سوا تمہیں اور کچھ نہیں بتاؤں گا۔ یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ میری رجمنٹ کہاں ہے اور میں چھٹی گزار کر کہاں جاؤں گا۔"

"اپنا مشن پورا کر کے آؤ گے؟" میں نے پوچھا۔" مجھے کتنا عرصہ انتظار کراؤ گے؟"

"ساری عمر انتظار کر سکو گی؟" اُس نے مسکرا کر کہا۔" میرا مشن ایسا ہے کہ میں جلدی بھی آ سکتا ہوں، زیادہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم جب تک زندہ رہو میرا انتظار کرتی رہو۔"

"ساری عمر انتظار کراؤ گے؟" میں نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

"زندہ رہا تو آ جاؤں گا۔" اس نے کہا۔" مگر میں توقع نہیں رکھوں گا کہ تم زیادہ دیر انتظار کرو گی۔ میں تمہیں قید کر کے تو نہیں جا رہا۔ یہ وعدہ ضرور کر دوں گا کہ زندہ رہوں گا تو ضرور تمہارے پاس آؤں گا۔ جہاں کہیں چلی جاؤ گی ڈھونڈ لوں گا۔ تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ نہیں آ سکوں گا تو تمہیں میری طرف سے اطلاع مل جائے گی کہ میں کہاں ہوں۔"

میں اُس کے جذبے کو سمجھ چکی تھی، اس لیے اس کے مشن کو بھی کچھ کچھ سمجھ گئی۔

اُس نے کہا تھا کہ رَن کچھ کی لڑائی ختم ہوتی ہے جنگ ختم نہیں ہوتی۔ ہندوستان کے وزیراعظم نے دھمکی دی تھی کہ ہندوستان کی فوج اَب اپنی مرضی کا محاذ کھولے گی۔ اس کے کہنے کے مطابق اُس کے رجمنٹ کمانڈر نے اسے بتایا تھا کہ جنگ کے لئے تیار رہو۔ وہ فوجی تھا۔ اسے لڑنا تھا اور مرنے کا امکان واضح تھا۔ میں نے سوچا کہ اسی امکان کے پیشِ نظر اس نے کہا ہے کہ شاید تمہیں ساری عمر انتظار کرنا پڑے۔ یہ تو میرے دل نے اور میری عقل نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ یہی وہ آدمی ہے جسے میں ڈھونڈتی رہی ہوں اور میں اس کے لئے ساری عمر انتظار کروں گی۔ پھر بھی میں نے اسے کہا۔ "مجھے تفصیل نہ بتاؤ۔ اشارہ سا کر دو کہ تمہارا مشن کیا ہے۔ تمہیں لڑنے کے لئے جانا ہوگا؟"

"تو اور کیا!" اُس نے کہا۔ "انڈین آرمی کے ساتھ فٹ بال میچ تو نہیں ہوگا۔" اُس نے سکون کی آہ بھری اور اپنے آپ سے بات کرنے کے لہجے میں کہا۔ "انڈیا۔ ہندو۔" اس نے اچانک اپنی ہتھیلی پر گھونسہ مار کر کہا۔ "ہماری گورنمنٹ معلوم نہیں انتظار کیوں کر رہی ہے۔ اِن سیاسی لیڈروں نے فوج کو ہمیشہ ذلیل کیا ہے۔"

وہ یقیناً ابنارمل ذہن کا آدمی تھا اور وہ یقیناً معمولی قسم کا فوجی نہیں تھا۔ مجھے وہ اچھا تو لگتا ہی تھا لیکن ہندوستان کے خلاف اس کا یہ جذبہ دیکھا تو مجھے فخر محسوس ہونے لگا کہ مجھے اس شخص سے محبت ہے اور یہ میرا ہے۔ وہ ہندوستان کی دشمنی کی باتیں کر رہا تھا اور میرے اندر انتقام کا وہی جذبہ بیدار ہوتا جا رہا تھا جس نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ میں نے ایسی باتیں کبھی نہیں سوچی تھیں۔ میری زبان پر کبھی ایسی باتیں نہیں آتی تھیں۔ میں شراب اور گناہ میں ڈوب گئی تھی۔ وہاں کوئی ملک اور کوئی سرحد نہیں تھی۔ وہاں کوئی جذبہ اور کوئی مشن نہیں تھا لیکن اس آدمی کی باتوں اور اس کے پُرجوش انداز نے میرے اندر اپنے والی سوچیں جگا دیں۔ میں نے اس سے رَن کچھ کی لڑائی کی باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔ اس نے جب مجھے رَن کچھ کی واردات سنائی تو مجھے ایسے لگا جیسے میری ذات میں انقلاب آ رہا ہے اور میں بدلتی جا رہی ہوں اور پھر میں نے یوں بھی محسوس کیا کہ میری شخصیت

اس آدمی کی ذات میں تحلیل ہوتی چلی جا رہی ہے اور میری کوئی ذات، کوئی انفرادیت اور کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔

باتیں کرتے کرتے ہم پلنگ پر اکٹھے لیٹے اور سو گئے۔ دوسرے دن دوپہر کا کھانا کھا کر وہ چلا گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اس آدمی کا انتظار ساری عمر کرتی رہوں گی۔ کچھ اور حقائق بھی تھے جو میں نے بالکل نہیں سوچے۔ مثلاً یہ کہ وہ چلا جائے گا تو میں کہاں رہوں گی۔ اس ہوٹل میں صرف پیشہ ور عورت کی حیثیت سے رہ سکتی تھی۔ اب تو منیجر نے مجھے اس لالچ میں مفت رکھ لیا تھا کہ میں مستقل طور پر اس کے پاس آ جاؤں گی مگر میں اَب اس پیشے میں واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ بہرحال اس کا مجھے کوئی غم نہ تھا کیونکہ میری بنک میں خاصی رقم تھی۔

وہ اگلے روز میرے کمرے میں آیا اور اس نے بتایا کہ کل اُس کی چھٹی ختم ہو جائے گی اور وہ کل دوپہر تک چلا جائے گا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کہاں جائے گا صرف یہ کہا۔ "میں مہینے میں ایک دو دنوں کے لئے آیا کروں گا۔" اس نے جیب سے سَو سَو روپے کے نوٹوں کا بنڈل نکال کر میرے آگے رکھ دیا اور کہا۔ "یہ ہے میری ساری عمر کی پونجی ساڑھے چھ ہزار روپے۔ یہ امانت نہیں۔ تمہیں ضرورت ہو تو خرچ کر سکتی ہو۔"

میں یہ رقم نہیں لینا چاہتی تھی کیونکہ میرے جسم اور رقم کا بڑا ہی قریبی رشتہ تھا۔ میں رقم کو ہمیشہ اپنے جسم کی اُجرت سمجھتی رہی ہوں۔ یہ جانتے ہوتے کہ اُس نے

مجھے اُجرت نہیں دی اور وہ مجھے اپنی منگیتر بنا چکا ہے، میں نے رقم دیکھی تو میں بدک کر پیچھے ہٹ گئی اور کہا۔ "اُٹھا لو یہ روپے۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔"

"تو اور کسے دوں؟" اُس نے پوچھا۔ "تم اس رقم کی مالک نہیں بننا چاہتی؟"

میں فوراً سنبھل گئی اور اسے صاف بتا دیا کہ میں نے کیا محسوس کر کے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے نوٹوں کا بنڈل اُٹھا لیا اور جانے مجھے کیا ہو گیا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں سمجھ نہیں سکی کہ یہ مسرت کے آنسو تھے یا ہے بسی کے۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہ پہلا مرد تھا جس نے میرے جسم کے ساتھ

کوئی دلچسپی نہیں رکھی تھی۔ اس کے بازوؤں میں میں نے ایسا سکون محسوس کیا جیسے اس نے مجھے جنوں بھوتوں اور چڑیلوں سے بچا کر پناہ میں لے لیا ہو۔ میں سنبھل گئی۔ بہت دیر تک اس کی گود میں سر رکھے لیٹی رہی۔ مجھ پہ بےخودی طاری ہو گئی تھی۔

ہم باہر چلے گئے۔ ٹہلتے ٹہلتے کشمیر پوائنٹ پر پہنچ گئے اور ایک بلند جگہ جا بیٹھے۔ میری آنکھوں میں مری کا حسن لوٹ آیا تھا، بلکہ پاکستان کا یہ خطّہ مجھے جنت سے زیادہ دلکش نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اُس سے کوئی بات کی تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کشمیر کے اُن پہاڑوں کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھ رہا تھا جن کی چوٹیوں پر سفید سفید برف جمی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے کا تاثر بالکل ہی بدل گیا تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہُوا تھا۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ وہ شاید بھول گیا تھا کہ میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی ہوں۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو بھی وہ گُم سُم رہا۔ میں نے سر اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اُس نے اپنا ایک بازو میرے گرد لپیٹ دیا۔ اس سے زیادہ اس نے کوئی توجہ نہ دی۔

میں نے آخر جھنجھوڑا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے پوچھا۔

"کہاں گُم ہو گئے ہو؟"

"کشمیر کی اُن پہاڑیوں میں۔"

"سفید سفید برف نیلے آسمان کے ساتھ بہت اچھی لگتی ہے۔" میں نے کہا

"سفید نہیں۔" اُس نے آہ بھر کر کہا۔ "یہ برف انسانوں کے خون سے لال ہے۔ دُور سے سفید لگتی ہے۔ میں انہیں قریب جا کر دیکھوں گا۔"

"کب؟"

وہ چونک پڑا اور بولا۔ "وہاں تک جانا آسان تو نہیں۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔"

مگر اس کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ اُس نے کوئی بات مجھ سے چھپالی ہے یا وہ جو کچھ سوچ رہا تھا وہ مجھے بتانا نہیں چاہتا تھا.... یہ راز دو مہینے بعد کھُلا کہ وہ برف سے لدی ہوئی ان چوٹیوں کو کیوں اتنا بےخود ہو کر دیکھ رہا تھا۔

اب میں ان برف پوش چوٹیوں کو اُسی کی طرح ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہوں اور مجھ سے کوئی نہیں پوچھتا کہ ان چوٹیوں کو اتنا بےخود ہو کر کیوں دیکھ رہی ہو

اور وہ چلا گیا

اُس رات وہ میرے پاس رہا۔ ہم بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے رہے۔ سنجیدگی سے باتیں بھی کیں اور رات ایک ہی پلنگ پر سوتے۔ وہ سورج نکلنے سے بہت پہلے جاگ اُٹھا۔ مجھے بھی جگا دیا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر اُس نے ناشتہ کیا۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ جانے لگا تو اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو اُسے کبھی نہ جانے دیتی۔ ہم نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں جکڑے رکھا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اُس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی مگر میری گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو میرے بازوؤں سے چھڑایا اور کوئی بات کئے بغیر دوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ میں کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ ہوٹل والی پہاڑی سے اُترنے کا راستہ کھڑکی سے نظر آتا تھا۔ وہ مجھے نظر آیا۔ دُور نیچے چیل کے پیڑوں میں وہ رُکا۔ پیچھے دیکھا۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ اُس نے بھی ہاتھ ہلایا اور پھر وہ میرے آنسوؤں کے دھند لکے میں رُوپوش ہو گیا۔ میں نے جلدی سے آنسو پونچھے اور دیکھا۔ اب وہاں لمبے لمبے پیڑ تھے، وہ نہیں تھا۔

میں اُس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی لیکن دل کو یہ سوچ کر بہلا لیا کہ مجھے وہ مرد مل گیا ہے جو مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔ وہ سراپا پیار تھا۔ اس نے مذاق میں بھی کوئی بیہودہ بات نہیں کی تھی۔ وہ میرے پاس سویا رہا تو بھی اس نے کوئی بیہودہ حرکت نہیں کی۔ میں مستقبل کے تصوروں میں کھو گئی اور اس کے تصوروں سے ہی دل بہلاتی رہی۔

چند دنوں بعد میرے سمگلر کا پیغام آیا۔ وہ مجھے جلدی آنے کو کہہ رہا

تھا۔ میں نے جواب دیا کہ ایک مہینہ اور یہیں رہوں گی۔ ہوٹل کا منیجر مجھے الگ زور دے دے کر کہہ رہا تھا کہ میں ہوٹل میں رہوں اور نہ جاؤں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ مجھے ذرا سستا لینے دو۔ بعد میں فیصلہ کروں گی۔ میں نے اُسے جھوٹی تسلی دے دی کہ میں یہیں رہنے کی کوشش کروں گی۔ میں نے تنہائی سے بچنے کے لئے ہوٹل کی محفلوں میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ بعض آدمیوں نے جن میں غیرملکی بھی تھے، مجھے دوست بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ میں انہیں ٹالتی ٹرخاتی رہی اور ایک مہینہ گزر گیا۔

وہ اچانک آگیا۔ میں کمرے میں تھی۔ ہم بے تابی سے ملے۔ وہ صرف ایک رات کے لئے آیا تھا۔ اس نے اپنی سروس کے متعلق صرف اتنا بتایا کہ مشن کا وقت قریب آرہا ہے۔ وہ خوش تھا۔ اچانک جذباتی ہو کر مجھے اپنے قریب کر لیتا اور اچانک ہی اس کا موڈ بدل جاتا۔ رات کو اُس نے مجھ سے پوچھا "اگر میں جنگ میں مارا گیا تو تم کیا کرو گی؟ مجھے بھول جاؤ گی؟"

میں نے اس کی زندگی کے اس پہلو پر تو کبھی غور کیا ہی نہیں تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ شہید ہو جائے گا یا اس کی ایک یا دونوں ٹانگیں یا بازو کٹ سکتے ہیں یا وہ آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو سکتا ہے۔ اس نے جب کہا۔ "اگر میں مارا جاؤں" تو میں نے بے قابو ہو کر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور اس کا سر اپنے سینے سے اس طرح لگا لیا جیسے موت کسی ماں سے اس کا بچہ چھیننے کے لئے اس کے سر پر آن کھڑی ہوتی ہو۔ میں نے سسک سسک کر کہا۔ "خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ تم نہیں مر سکتے۔"

وہ آہستہ آہستہ مجھ سے الگ ہوا۔ اُس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے قریب کر لیا اور کہا۔ "میری آنکھوں میں دیکھو زہی!" میں نے دیکھا تو اُس نے کہا۔ "جذبات سے نکلو۔ میں مر نہیں چلا لیکن حقیقت حقیقت ہی ہوتی ہے۔ سپاہی اور موت کا بڑا گہرا یارانہ ہے۔ ہو سکتا ہے میں تمہیں مل نہ سکوں، میری موت کا پیغام ملے اور ہو سکتا ہے میں اپنا مشن پورا کر کے ہنستا کھیلتا تمہارے پاس آجاؤں، لیکن میں یہ تمہیں صاف الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان نے مجھ

سے جان مانگی تو میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ میں یہ نہیں سوچوں گا کہ زہی میرا انتظار کر رہی ہے، میں نہ مروں۔"

میں نے آہ بھری اور چپ ہو گئی۔ اُس نے باری باری میری دونوں آنکھیں چومیں اور مجھے اپنے ساتھ لگا کر لیٹ گیا۔ وہ بڑے مضبوط کردار کا جوان تھا۔ دو چار منٹ بعد گہری نیند سو گیا اور میں جاگتی رہی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے بازوؤں سے نکلی، اتنی آہستہ کہ اس کی آنکھ نہ کھلی، مگر نیند میں اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا نہیں۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں ہلکے نیلے رنگ کا مدھم سا بلب جل رہا تھا۔ نیلی نیلی ہلکی ہلکی روشنی میں، میں اس کے چہرے کو ہی دیکھتی رہی۔ سوتے میں تو وہ بالکل بچہ لگتا تھا۔ میرا بچہ وہی بچہ جسے میری کوکھ نے جنم دیا تھا اور جس کی میں نے صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے چہرے پر بچوں والی معصومیت تھی

"میری آنکھوں میں دیکھو زہی!" کمرے میں مجھے اس کی آواز سنائی دینے لگی۔ "پاکستان نے مجھ سے جان مانگی تو میں انکار نہیں کر سکوں گا۔" میں نے بڑی ہی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ ورنہ میں اسے بازوؤں میں دبوچ کر سینے سے لگانے لگی تھی۔ اگر درمیان میں پاکستان کا نام نہ آجاتا تو میں اُسے نہ جانے دیتی۔ مجھے پاکستان سے پیار تھا۔ میں تو پاکستان کو ذہن سے اُتار بیٹھی تھی۔ مجھے اسی نے یاد دلایا تھا کہ پاکستان ہمارا ملک ہے، ہندو ہمارا دشمن ہے اور ہم نے خون کے دریاؤں کی قربانی دے کر یہ خطہ حاصل کیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ تلخ سا خیال ضرور آیا کہ پاکستان اگر اتنی معصوم جان کا نذرانہ نہ مانگے تو کیا یہ ملک قائم نہیں رہ سکے گا؟ میں نے دل ہی دل میں خدا سے التجا کی کہ اگر اس کی سرزمین کو ایک جان کی ہی ضرورت ہے تو میری جان لے لے مگر میری جان شاید اتنی زیادہ ناپاک ہو چکی تھی کہ خدا کو اس کی قربانی منظور نہیں تھی۔

میں اُسے دیکھتی رہی۔ اُس نے سوتے سوتے میرا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔ اس کا بچپن میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ میرے آنسو نکل آتے اور میں سوچنے لگی کہ یہ کتنی اذیت سہہ کر جوان ہوا ہے اور کتنا مقدس جذبہ لے کر جوان ہوا ہے۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پر مجھے دھوکے اور فریب کا ہلکا سا تاثر بھی نظر نہ آیا۔ پھر میں سوچنے لگی کہ اس کا مشن کیا ہے جو وہ مجھے بتاتا

نہیں چاہتا تھا۔ ایک خیال یہ آیا کہ جاسوسی کے لئے ہندوستان جا رہا ہوگا۔ اس نے مجھے جاسوس سمجھا تھا۔ اس سے میں سمجھی کہ وہ پاکستان کا تربیت یافتہ جاسوس ہے اور ہندوستان جا رہا ہوگا۔ پھر میں نے اُس کے مشن کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا اور دل میں طے کر لیا کہ اس سے بالکل نہیں پوچھوں گی کہ کہاں جا رہے ہو۔ اس کے سینے میں جو فوجی راز ہے اسے میں اُس کے سینے میں ہی رہنے دوں گی۔

مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں کتنی دیر بیٹھی اسے دیکھتی رہی اور خیالوں اور سوچوں میں اُلجھی رہی۔ آنکھ کھلی تو میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے رکھا تھا اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ رات کو مینہ بھی برستا رہا تھا..... وہ بھی جاگ اُٹھا، وہ بہت ہی خوشگوار موڈ میں تھا۔ ہنستا کھیلتا رہا۔ جانے کیوں میرے ذہن میں ایک سوال آ گیا جو میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے دوستوں کو معلوم ہوگا کہ تمہاری پچھلی زندگی کس طرح گزری ہے اور تم گھر سے بھاگے ہوئے ہو۔"

"نہیں!" اُس نے جواب دیا۔ "کسی کو معلوم نہیں۔ میرے ساتھی افسروں کو میرے متعلق یہ معلوم ہے کہ میں ..... کا رہنے والا ہوں۔ میرے ماں باپ ہیں اور میں کھاتے پیتے خوش باش خاندان کا آدمی ہوں۔ ہماری سوسائٹی میں لعنت یہ ہے کہ ہم جذبے اور ایمان سے نہیں بلکہ خاندان کی اونچ نیچ سے پہچانے جاتے ہیں، اس لئے میں نے اپنی گزری ہوئی زندگی کے متعلق کبھی کسی کو نہیں بتایا۔"

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ چلا گیا، اور اَب کے میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ میرے سینے سے میرا دل بھی نکال کر ساتھ ہی لے گیا ہو۔

آخری ملاقات

وہ کہہ گیا تھا کہ بیس پچیس روز بعد آؤں گا۔ میں نے اِدھر اُدھر دل بہلانے کی کوشش شروع کر دی۔ برقعہ اوڑھ کر باہر نکل جاتی۔ کبھی شامیں ہوٹل کی محفلوں میں گزارتی اور کبھی منیجر کے ساتھ گپ شپ لگانے بیٹھ جاتی۔ اس نے میرے کیپٹن کے متعلق پوچھا تو میں نے جھوٹ بولا اور اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیپٹن ہے اور میرا اس کے ساتھ کتنا پاکیزہ رشتہ ہے۔ ایک روز ایوب کی حکومت کے ایک بہت بڑے صاحب بہادر نے مجھے ہوٹل میں دیکھ لیا۔ اس کی تو باچھیں خوشی سے پھٹنے لگیں۔ سمگلنگ کے سلسلے میں میں تین بار اس کے پاس گئی تھی۔ اس نے رات میرے کمرے میں گزارنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے ایک اندرونی تکلیف کا بہانہ بنا کر اسے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ ٹلتا ہی نہیں تھا۔ اس نے احسان جتانے شروع کر دیئے اور میں بات پر نہ آئی تو غصے میں دھمکی دے کر چلا گیا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ مری میں رونق تھی۔ سرکاری افسر اور سیاسی لیڈر چند دنوں کے لئے مری آتے تھے اور اسی ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ میں ان سے چھپنے کی کوشش کرتی تھی مگر کوئی نہ کوئی مجھے دیکھ ہی لیتا تھا۔ میں یہ بہانہ پیش کرتی کہ اندرونی تکلیف ہے اور علاج کے لئے آئی ہوں۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے..... یہ لوگ جس بُری طرح میرے پیچھے پڑتے تھے اس سے مجھے فکر ہونے لگتا تھا کہ یہ لوگ تو اُس وقت تک میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک میرے حسن اور جوانی میں کشش باقی رہے گی۔ مجھے خوشی اس پر تھی کہ میں نے کیپٹن کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ اُسے دھوکے میں نہیں رکھا تھا۔

بیس بائیس دن گزر گئے۔ ایک روز وہ اچانک آ گیا۔ میں کمرے میں تھی۔ اب

آپ ان باتوں کو چھوڑیئے کہ میں کس طرح پاگلوں کی طرح اسے ملی۔ اگر آپ نے کوئی ایسی ماں دیکھی ہو جس کا بچہ گم ہو گیا ہو اور ایک عرصے بعد اُسے اچانک مل گیا ہو تو آپ سمجھ جائیں گے کہ میں کس کیفیت میں اپنے کیپٹن سے ملی ہوں گی، مگر اس نے مجھے ایسے کڑے امتحان میں ڈال دیا جو میری برداشت سے باہر تھا۔ میرے جذبے لرز کر ڈھیر ہو گئے۔ اس نے کھانے سے فارغ ہو کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا۔ "زیبی اگست ۱۹۴۷ء کو یاد کرو۔ انڈیا سے اپنی ہجرت کو یاد کرو۔" وہ چُپ ہو گیا۔ اس کے لب و لہجے اور انداز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس نے کہا۔ "اب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں اُن معصوم شہیدوں کے خون کا انتقام لینے جا رہا ہوں جنہیں ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں اور سکھوں نے شہید کیا تھا۔" اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ایک فوجی کی حیثیت سے مجھے بالکل نہیں بتانا چاہیئے کہ میں کہاں جا رہا ہوں لیکن تم نے مجھے جو حیثیت دی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ میں تمہیں اندھیرے میں نہ رکھوں.... میں کمانڈو ہوں اور میں مقبوضہ کشمیر میں جا رہا ہوں۔"

تب مجھے یاد آیا کہ چند دنوں سے اخباروں میں اس قسم کی خبریں آ رہی تھیں کہ مقبوضہ کشمیر میں پُراسرار دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور ہندوستان پاکستان پر یہ الزام عائد کر رہا ہے کہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر میں اپنے تربیت یافتہ کمانڈو اور گوریلے داخل کر دیئے ہیں جو وہاں پُل اور گولہ بارود کے ذخیرے اور فوجی ٹھکانے تباہ کر رہے ہیں۔ میں نے ایک روز آل انڈیا ریڈیو کی بھی خبریں سنی تھیں۔ ان میں بھی ہندوستان نے یہی واویلا بپا کر رکھا تھا کہ پاکستان کے "گھس بیٹھیے" مقبوضہ کشمیر میں چوری چھپے داخل ہو گئے ہیں۔ میں کیپٹن میں اتنی گُم رہتی تھی کہ اس سے کبھی پوچھا ہی نہیں تھا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ اب اُس نے بتایا کہ وہ کمانڈو ہے اور کشمیر جا رہا ہے تو یہ ساری خبریں میرے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔

"میں اس مشن کا ایک مدت سے منتظر تھا۔" اس نے کہا۔ "انتظار ختم ہو گیا

ہے۔ میں کل جا رہا ہوں۔"

"میرا انتظار کب ختم ہو گا؟" میں نے رندھیائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جلدی۔" اُس نے کہا۔ "میں آجاؤں گا یا میری کوئی اطلاع آ جائے گی۔" اس نے ایک میجر کا نام بتایا جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گی۔ اس نے کہا۔ "یہ میجر تمہیں میری اطلاع یا پیغام خود دینے آئیں گے۔"

میں نے اُس سے بہت پوچھا کہ اس کا مشن کیا ہے۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں کس طرح داخل ہو گا اور واپس کس طرح آئے گا مگر اُس نے میرے سوالوں کا جواب صرف یہ دیا کہ یہ نہیں بتا سکوں گا۔ میں نے پھر اصرار نہیں کیا۔ میں جذباتی باتیں کرنے لگی تو اُس نے روک دیا اور کہا۔ "مجھے جذبات میں نہ الجھاؤ۔ آؤ حقیقت کی باتیں کریں۔" میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ اُمڈ کر آتے تھے جنہیں وہ کوئی مزاحیہ بات کہہ کر روک دیتا تھا۔ آخر وہ بھی جذباتی ہو گیا، لیکن اس کا جذباتی رنگ بھی حقیقی تھا۔ اُس نے اپنے ماضی کی اذیتوں کو یاد کیا اور میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اسے وہ پیار دیا ہے جس کی پیاس نے اس کا سینہ جلا ڈالا تھا.... اس کی اس قسم کی باتوں نے مجھے بے قابو کر دیا۔ میں اس کے ساتھ لپٹ گئی اور بچوں کی طرح روئی۔

شام کے چھ بج رہے تھے جب اس نے اپنے آپ کو مجھ سے نوچ لیا اور رخصت ہونے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو برقعے میں چھپایا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ میں بہت آہستہ چلنا چاہتی تھی مگر وہ دوڑنے کی رفتار چل رہا تھا۔ میں نے ایک بار اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ "ذرا آہستہ چلو۔" اُس نے ہنس کر کہا۔ "خاکی وردی سے دل لگایا ہے تو دوڑنے کی پریکٹس کرو۔" اور ہم اُس جگہ پہنچ گئے جہاں اس نے صرف اتنا کہا۔ "زیبی! خدا حافظ۔"

وہ رُکا نہیں۔ اُس نے میری طرف دیکھا نہیں۔ میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ ڈھلان سے اتنی تیز اُترا کہ ایک لمحے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ شاید اس لئے بھاگ اٹھا تھا کہ میرے آنسو اُس کے مشن کو ناکام کر دیں گے۔ میں وہیں کھڑی رہی۔ چند منٹوں بعد وہ مجھے دُور نیچے چیل کے پیڑوں میں سے

گزرتا نظر آیا۔ وہ رُک گیا۔ میری طرف دیکھا۔ اس نے بازو اُوپر کر کے ہلایا۔ وہ آگے کو چل پڑا اور ایک مکان کی اوٹ میں ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں وہیں کھڑی رہی۔ سورج ڈوب گیا۔ چیل کے پیڑ اور مری کا سبزہ تاریکی میں گم ہو گیا۔ میں وہیں کھڑی رہی۔

اُس روز کے بعد میری زندگی کا ہر ایک دن کشمیر پوائنٹ کی ایک بلند جگہ پر بیٹھے اور کشمیر کی برفانی چوٹیوں کو دیکھتے گزرنے لگا۔ میری شامیں اُداس ہو گئیں، راتیں ویران ہو گئیں اور میں ہر وقت اُس کی سلامتی کی دعائیں کرنے لگی۔ کمرے میں میری حالت یہ ہوتی کہ باہر کسی کے قدموں کی آواز سنتی تو یہ توقع رکھنے کی بجائے کہ میرا کیپٹن آ رہا ہے، یہ سمجھتی کہ وہ میجر آ رہا ہے جس کا وہ غائبانہ تعارف کرا گیا ہے۔ قدموں کی یہ آہٹ مجھے ڈرا دیتی۔ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ جانے میرے دل کو یہ کیوں کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کیپٹن کی بجائے میجر آئے گا اور وہ اچھی خبر نہیں لائے گا۔ اُن دنوں (اگست ۱۹۶۵ء) ہندوستان کے بعض اخبار بھی یہاں آیا کرتے تھے۔ ان میں انگریزی کا اخبار "سٹیٹسمین" اس ہوٹل میں آتا تھا۔ میں نے یہ اخبار ہر روز دیکھنا شروع کر دیا۔ اس میں ہمارے کمانڈوز کی کارروائیوں کی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اسی اخبار میں آزاد کشمیر یا پاکستان آرمی کے ایک کیپٹن اور تین کمانڈو جوانوں کی تصویر شائع ہوتی تھی۔ انہیں مقبوضہ کشمیر میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

اس کیپٹن کی تصویر دیکھ کر میں اپنے کیپٹن کی تصویر میں کھو جاتی تھی۔

مجھ میں یہ تبدیلی ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے جتنا پیار اپنے کیپٹن کے ساتھ تھا اتنا ہی عزیز مجھے پاکستان تھا۔ میں دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پاکستان کو اپنے کیپٹن پر قربان کر دوں۔

کیپٹن کی خبر میجر لایا

آخر ایک روز قدموں کی وہ آہٹ جو میں ہر روز سنا کرتی تھی اور جو میرے دروازے سے آگے نکل جایا کرتی تھی، میرے دروازے پر رُک گئی۔ دروازے پر دھیمی سی دستک سنائی دی۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ گٹھے ہوئے جسم کا ایک میجر کھڑا تھا۔ وہ وردی میں تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "زیبی؟"

"جی" میں نے کہا۔ "فرمایئے۔ آپ اُس کی کوئی خبر لائے ہوں گے؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتا کمرے میں آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور کہا۔ "تشریف رکھیے"۔ وہ بیٹھا نہیں۔ میری طرف گھوما۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اس کے چہرے پر اداسی نہیں تھی۔ چہرے پر وہی سنجیدگی اور رونق تھی جو فوجیوں کے چہروں پر ہُوا کرتی ہے۔ پھر بھی اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جو تحریر کی طرح نمایاں تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا اور چُپ رہا۔ میں نے اپنے جسم کے اندر زلزلے کا جھٹکا محسوس کیا اور میں نے تیزی سے آگے ہو کر اس کے بازو پکڑ لیے۔ صبر کا دامن چھوٹ گیا اور میں نے اسے جھنجھوڑ کر رندھیائی ہوتی آواز میں کہا۔ "کہہ دو وہ شہید ہو گیا ہے۔ کہہ دو میجر میں یہ خبر سُننے کے لئے تیار ہوں"۔

اس نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔ "اس کا آخری پیغام یہ ہے کہ زیبی سے کہنا روتے نہیں"۔

"نہیں روؤں گی"۔ میں نے سر جھٹک کر کہا۔ "نہیں روؤں گی" اور میری چیخیں نکل گئیں۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ اس نے مجھے چُپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر ہچکیاں لیتی رہی۔ وہ کھڑکی کے سامنے میری طرف پیٹھ کیے کھڑا رہا۔

"لاش کہاں ہے؟" میں نے بڑی دیر بعد سنبھل کر پوچھا۔

"کمانڈو کی لاش نہیں ملا کرتی۔" اُس نے میری طرف گھوم کر باوقار طریقے سے کہا۔ "سیدھی خدا کے پاس چلی جاتی ہے۔" وہ آہستہ آہستہ چلتا میرے پاس آگیا۔ اس کی عمر تیس سال سے کم لگتی تھی۔ جوان آدمی تھا۔ کہنے لگا۔ "میں بھی کسی کا کچھ لگتا ہوں۔ اب میری باری ہے۔ اگر ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بیویاں، باپ، بھائی اور بچے ہماری شہادت پر رونے بیٹھ گئے تو ایک دن قوم کے پاس رونے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہے گا۔ کیا تم ایسی قوم کو پسند کرو گی جو گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی ہو؟" اور وہ ایسے پُراثر لہجے میں بولتا رہا جس نے میرے سینے کے درد میں کمی کر دی۔

اُس نے بتایا کہ میرا کیپٹن دس جوانوں کی پارٹی لے کر مقبوضہ کشمیر میں گیا تھا۔ اس کا مشن بہت ہی خطرناک تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی واپس آنے کی امید نہیں تھی۔ بدقسمتی سے تارگیٹ کے قریب جا کر دشمن سے اُن کی ٹکر ہو گئی اور وہ گھیرے میں آگئے۔ جوانوں نے دشمن کو بڑی ہوشیاری سے الجھا لیا اور کیپٹن ایک جوان کے ساتھ تارگیٹ پر چلا گیا۔ اُس وقت وہ زخمی ہو چکا تھا۔ پھر بھی اُس نے مشن پورا کر دیا۔ دشمن اسے دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنے ہتھیاروں کی نالیاں ان دونوں کی طرف ہو گئیں اور وہ تارگیٹ کے ساتھ ہی اُڑ گئے۔ میجر نے بتایا کہ اس پارٹی میں سے صرف ایک جوان نکل کر آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاید ایک اور جوان بھی نکل گیا تھا لیکن کہیں بھٹک گیا ہے۔

"آپ اس جوان سے مجھے ملوا سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"میں اس سے کیپٹن کے آخری وقت کی باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تفصیل سے پتہ چل جاتے کہ وہ کس بہادری سے شہید ہُوا ہے تو میرا غم شاید فخر میں بدل جاتے گا۔"

"فوجی احکام اجازت نہیں دیتے۔" اس نے کہا۔ "وہ تفصیل تو میں بھی آپ کو سنا سکتا ہوں لیکن سناؤں گا نہیں۔ میں آپ کو کبھی بھی نہیں بتاؤں گا کہ اس کا مشن کیا تھا اور تارگیٹ کہاں تھا اور وہاں تک اپنی پارٹی کے ساتھ وہ کس طرح پہنچا اور اُس نے گھیرے میں آکر کتنی عقل مندی سے لڑائی لڑی کہ مشن بھی مکمل کر دیا..... اس جوان سے تو آپ کبھی بھی نہیں مل سکیں گی۔ وہ آخر سپاہی ہے۔ جذبات میں آکر کوئی ایسی بات کہہ بیٹھے گا جو کسی فوجی کے سینے سے باہر نہیں آنی چاہیئے..... زبی! سمجھنے کی کوشش کریں۔" اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور تہہ کیا ہُوا ایک کاغذ مجھے دے کر کہا۔ "یہ ہے اس کا آخری پیغام۔"

میں نے کاغذ کھول کر پڑھا۔ (خط کا عکس ملاحظہ فرمایئے)۔ میجر نے کہا۔ "یہ خط بھی ایک کہانی ہے۔ جو جوان واپس آیا ہے اس نے بتایا کہ کیپٹن نے یہ خط تارگیٹ سے تھوڑی دُور بیٹھ کر لکھا تھا۔ یہ حملے کی رات سے چند گھنٹے پہلے کا لکھا ہُوا ہے خط لکھ کر کیپٹن نے اپنی پارٹی سے کہا تھا کہ میں شہید ہو جاؤں تو یہ خط میری جیب سے نکال کر میجر صاحب کو دے دینا۔ جب پارٹی تارگیٹ کی طرف بڑھی تو دشمن کے گھیرے میں آگئی۔ یہ جوان کیپٹن کے قریب تھا۔ کیپٹن نے خط حوالدار کو دیا اور کہا۔ "میں آگے جا رہا ہوں، پارٹی کی کمان لے لو۔ کیپٹن آگے گیا ہی تھا کہ حوالدار کی گردن سے گولی گزر گئی۔ خط ابھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس جوان نے لے لیا۔ پھر اسی کے پاس رہا۔"

کچھ دیر بعد میجر چلا گیا۔ میں نے یہ خط کوئی سو بار پڑھنے کی کوشش کی۔ صرف ایک سطر پڑھتی تھی، باقی خط آنسوؤں کی دھند میں چھپ جاتا تھا۔ اسے میں نے خوشبو لگا کر اٹیچی کیس میں رکھ دیا۔ میری ساری زندگی کا حاصل یہی چند الفاظ ہیں جو پیار کے ایک پیاسے نے شہید ہونے سے پہلے مجھے لکھے تھے۔ میجر چلا گیا تو سوچوں اور خیالوں نے میرے ذہن کے کھنڈروں میں اندھے چمگادڑوں کی طرح یلغار کر دی۔ وہ سوچیں اور وہ خیال آج بھی میرے ذہن میں بھٹک رہے ہیں، اور اب تو یہ زہریلی بھڑیں بن گئے ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ قوم نے کتنے پیارے پیارے نوجوان، کتنی پیاری پیاری لڑکیوں کی تمنائیں، آرزوئیں اور پیار اور کتنے سہاگ اور کتنے ہی منگیتر کشمیر اور پاکستان پر قربان کر دیتے ہیں۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ صرف اس لئے کہ دشمن ہم سے آدھا ملک چھین لے؟

یہ منیجر اس کے بعد مجھے نہیں ملا۔ آج تک وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ اس نے کہا تھا کہ اب میری باری ہے۔ شاید وہ بھی میرے شہید کیپٹن کے پیچھے چلا گیا ہو گا، کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔

مگر مجھے اپنے لیڈروں سے کوئی سوال پوچھنے کا حق حاصل نہیں کیونکہ میں طوائف ہوں۔ سوسائٹی میں میرا کوئی مقام نہیں لیکن مجھے اس ایک شہید کو یاد کر کے رونے سے تو کوئی نہیں روک سکتا جو میرا پیار دل میں لئے دشمن پر بجلی بن کر ٹوٹا تھا۔ اس کے لئے میں بہت روتی ہوں۔ اس کی شہادت کی اطلاع کے بعد میری جو ذہنی حالت ہوتی اسے میں صرف ان مختصر سے الفاظ میں بیان کر سکتی ہوں کہ میں مینٹل کیس بن گئی تھی۔ کبھی کبھی میں خود بھی چاہتی تھی کہ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیا جائے۔ یہ حالت ایک مہینہ رہی پھر میں سوچنے کے کچھ قابل ہو گئی اور حقیقت کا سامنا کرنے لگی۔ شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے پاس پیسہ کافی تھا۔ میں نے ایک روز ہوٹل کے منیجر سے کہا کہ اس نے مجھے اس توقع پر ہوٹل میں مفت رکھا ہوا ہے کہ میں سمگلروں سے تعلق توڑ کر اس کے پاس آجاؤں گی مگر میں اب کسی کے بھی کام نہیں آسکوں گی اور وہ اب مجھ سے ہوٹل کا بل وصول کرنا شروع کر دے۔

منیجر اچھا آدمی تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ وہ جو مجھے ملنے آیا کرتا تھا کون تھا اور یہ کہ وہ شہید ہو گیا ہے۔ منیجر نے مجھے قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر میں نہ مانی۔ میں نے جب یہ ارادہ کیا کہ کوئی باعزت ذریعہ معاش تلاش کروں تو پچھلے تمام تجربات سامنے آگئے اور اس کے ساتھ ایک اور حقیقت سامنے آگئی۔ میری امیدوں پر پانی پھر گیا اور مستقبل میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ اس طرح کہ میرا سمگلر بادشاہ کئی بار مجھے واپس بلا چکا تھا اور میں ٹال رہی تھی۔ ایک روز وہ آگیا اور بولا "تم اس ہوٹل کی زندگی کو زیادہ پسند کیوں کرتی ہو۔ مجھے صاف جواب دو۔"

میں نے اسے جواب دے دیا اور اسے بتا دیا کہ میں کس حادثے کا شکار ہو گئی ہوں۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ میں ذہنی بلکہ دماغی لحاظ سے بیکار ہو گئی ہوں اس لئے اب اُس کے کام نہیں آسکوں گی۔ اُس کے ساتھ باتیں کرتے میں بے تحاشہ روتی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں واقعی اُس کے کام کی نہیں رہی۔ اُسے تو تیز طرار اور خوش باش

لڑکیوں کی ضرورت تھی مگر اُس کے سامنے مشکل یہ آگئی تھی کہ اُس کے راز میرے سینے میں تھے۔ اس پائے کے سمگلروں کا یہ دستور ہے کہ ان کا کوئی ساتھی کوئی راز لے کر بھاگ جائے تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ میرا حشر بھی یہی ہونا چاہیے تھا، لیکن اُس نے مجھ پر اعتماد کیا۔ البتہ یہ کہہ گیا کہ اگر میں نے اسے دھوکہ دیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔

میں نے بیسوائی کے پیشے سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا لیکن مجھے جلدی ہی احساس دلا دیا گیا کہ میں صرف خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہ افسر صاحبان جن کے ساتھ میرا تعلق رہ چکا تھا میرے ارد گرد منڈلا رہے تھے اور میں بیماری کا بہانہ کر کے انہیں ٹال رہی تھی، مجھے پھانسنے لگے۔ ان میں سے ایک تو ایک روز میرے کمرے میں دلیر ہو گیا۔ میں نے اسے کیپٹن شہید کے متعلق بتایا اور رو رو کر اُس پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ شہید کے پیار کو ناپاک نہیں ہونے دوں گی مگر اُس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اس کی ہوس کار نگاہوں میں شہید کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے جب یہ کہا۔ "کیسا شہید، وہ قوم کا ملازم تھا۔ اسے تنخواہ ملتی تھی۔ اپنی ڈیوٹی کے لئے گیا اور مارا گیا۔ بات ختم ہو گئی۔" تو میں نے چڑیلوں کی طرح اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ میں نے جو مُنہ میں آیا بک ڈالا مگر وہ مسکراتا رہا اور جب میں چُپ ہوتی تو اس نے کہا۔ "آج کل کسی کی طرف اشارہ کر کے کہہ دو کہ یہ جاسوس ہے تو اُسے بغیر مقدمے کے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میں کسی بھی وقت تمہیں انڈیا کی جاسوس کے الزام میں بند کروا سکتا ہوں۔ سوچ لو۔" اور وہ چلا گیا۔

دوسرے ہی دن مجھے نہ صرف اس کی بلکہ دو اور کی بھی دھمکیاں ملنے لگیں۔ میری ذہنی حالت پہلے ہی بگڑی ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھے بالکل پاگل کر دیا۔ اس پاگل پن میں میں نے ان میں سے ایک کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا۔ "میں اچھی قسم کی طوائف ہوں۔ اب میں کسی سمگلر کی دی ہوتی رشوت نہیں ہوں۔ یہ میری فیس ہے۔ پیشگی ادا کرو۔"

مجھے ایسے جال میں پھانس لیا گیا تھا جس سے میں نکل نہیں سکتی تھی۔ میں آپ کو یہ نہیں بتانا چاہتی کہ میں اِدھر سے بھاگی تو کدھر گئی۔ وہاں سے نکلی تو کہاں جا دم

لیا۔ میں نے اس جال سے نکلنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر میں اکیلی تھی۔ چھوٹی سی ایک مچھلی جسے کھانے کو بڑی مچھلیوں سے سمندر بھرا ہُوا تھا۔ میں ایسی ڈوبی کہ اُبھر نہ سکی اور اب تو میں اُبھرنا چاہتی بھی نہیں۔ امنگ مرگئی ہے۔ تمنا مرگئی ہے۔ ارادے مرگئے ہیں۔ اپنے شہید کی زیبی مرگئی ہے۔ ایک طوائف زندہ ہے جس کے بھائی بھی اس کے گاہک ہوتے ہیں، اور جس کے باپ بھی اس کے گاہک ہوتے ہیں۔

میں کسی کی بہن نہیں!

میں کسی کی بیٹی نہیں!

میری زیبی

میری محبت اور میرے سلوٹ قبول کرو۔ دشمن کے سر پر بیٹھ کر تمہیں یہ آخری الفاظ لکھ رہا ہوں۔ اپنے مجاہدوں سے کہہ دیا ہے کہ میں شہید ہو جاؤں تو یہ خط تم تک پہنچا دیں۔ معلوم نہیں تم تک میرے آخری الفاظ پہنچ سکیں گے یا نہیں۔ میں خوش ہوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ سیدھی سیدھی بات کروں گا۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا۔ ڈرنا بالکل نہیں۔ آخری وقت دل میں خدا کی یاد ہے یا تمہاری یاد ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے جوانوں کے ساتھ دشمن پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑونگا۔ مقبوضہ کشمیر میں ایسا دھماکہ ہوگا جو دلی میں لیڈروں کو لرزا دے گا۔ میں اس مشن کے لیے زندہ تھا۔ تمہارے لیے زندہ رہنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن اس وقت اپنا مشن مجھے تم سے زیادہ پیارا ہے۔ میں واپس نہیں آیا تو رونا نہیں اور مجھے بھول جانا۔ اپنے آپ کو میری یاد سے آزاد کر لینا۔ کسی کے ساتھ شادی کر لو تو بہت اچھا ہوگا۔

میں مشن میں ضرور کامیاب ہونگا۔ تمہارے پیار نے مجھے بہت حوصلہ دیا ہے۔ کشمیر میں جب میرا خون بہے گا تو اس میں تمہارے پیار کی خوشبو ہوگی۔ یہی سمجھ لو کہ تم نے اپنی محبت کشمیر پر قربان کر دی ہے۔

خدا حافظ زیبی

صرف تمہارا

[redacted]